کتاب و سنت اور اسلافِ اُمّت کی تعلیمات کا علمبردار

ماہنامہ

اشرف الجرائد

حیدر آباد

Volume:19 Issue:4 April 2026

مُدیر

مولانا محمد عبد القوی

ادارہ اشرف العلوم ٹرسٹ حیدر آباد

www.ashrafululoomhyd.com

اشرف الجرائد میں شامل تمام مضامین کی تمام جزئیات سے مدیر کا اتفاق ضروری نہیں

آئینۂ مضامین

اشرف الجرائد کی توسیع واشاعت میں حصہ لے کر اشاعتِ دین کا ثواب حاصل فرمائیں۔ ادارہ

درسِ قرآن



اپنی نسلوں کے ایمان کا تحفظ وقت کا اہم ترین تقاضہ ہے

از: مولانا شیخ عبدالقادر فرید قاسمی*

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

أَمْ كُنتُمْ شُهَدَاءَ إِذْ حَضَرَ يَعْقُوبَ الْمَوْتُ إِذْ قَالَ لِبَنِيهِ مَا تَعْبُدُونَ مِن بَعْدِي قَالُوا نَعْبُدُ إِلَٰهَكَ وَإِلَٰهَ آبَائِكَ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ إِلَٰهًا وَاحِدًا وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ (البقرہ: ۱۳۳)

ترجمہ: کیا اس وقت تم موجود تھے جب یعقوب کی موت کا وقت آیا تھا، جب انہوں نے اپنے بیٹوں سے کہا تھا کہ تم میرے بعد کس کی عبادت کرو گے؟ اُن سب نے کہا تھا کہ: ہم اسی ایک خدا کی عبادت کریں گے جو آپ کا معبود ہے اور آپ کے باپ دادوں ابراھیم، اسماعیل اور اسحاق کا معبود ہے، اور ہم صرف اسی کے فرماں بردار ہیں۔

تشریح: اولاد اللہ پاک کی بہت بڑی نعمت ہے، جہاں وہ ایک نعمت ہے وہیں ایک بڑی آزمائش اور ذمہ داری بھی ہے، ذمہ داری یہ ہے کہ اپنی اولاد کا اچھا نام رکھا جائے، حلال، صحت بخش غذا کا نظم کیا جائے، اسلامی نہج پر ان کو تعلیم وتربیت سے دی جائے، ان کے کردار کو شرعی، اور ایمان کو محفوظ رکھنے کی فکر کی جائے۔

والدین اِن ذمہ داریوں کو لے کر فکری طور پر منقسم ہوجاتے ہیں بعض کا خیال اپنی اولاد کو بہتر کھلانے پلانے اور عمدہ پوشاک کا ہوتا ہے اور کچھ اونچا خیال رکھنے والے تعلیم وتربیت پر توجہ مرکوز رکھتے ہیں ان کا ماننا یہ ہوتا ہے کہ بہتر تعلیم ہی روشن مستقبل کی ضامن ہوتی ہے اور کچھ دینی ذوق رکھنے والے باتوفیق والدین کا مطمح نظر تعلیم وتربیت کے ساتھ اپنی اولاد کو مؤحد، متبع سنت بنانے کا ہوتا ہے اور ایسے خوش نصیب قال قال ہوتے ہیں واقعہ یہ ہے کہ جس کے پاس جو ذمہ داری اہم ہے وہ اس کے لیے کوشاں اور فکرمند ہے، جب کہ اولاد کی تربیت کے حوالے سے فکر یعقوبی اور مزاج دین یہ ہے کہ اپنے اہل وعیال کو مؤمن ومؤحد بنایا جائے اور ان کے سلامتئِ ایمان کی فکر سب سے زیادہ کی جائے، جب حضرت یعقوب علیہ السلام کی موت کا وقت قریب آیا تو فرزندان کو جمع کر کے پوچھا ''مَا تَعْبُدُونَ مِنۢ بَعْدِيْ'' تم میرے بعد کس کی عبادت کرو گے؟ یہ صرف ایک سوال ہی نہیں

* ذمہ دار ادارہ حسیب المدارس، گھٹکیسر، حیدرآباد

تھا بلکہ زندگی بھر کی فکروں کا نچوڑ اور بحیثیت والد اس ذمہ داری کا احساس تھا جو من جانب اللہ ہر ماں باپ کے کاندھے پر ہوتی ہے، اور آخرت میں قابلِ مواخذہ بھی ہوتی ہے کیوں کہ صالح اولا والدین کے لیے صدقہ جاریہ ہے تو بے دین اولاد دنیوی واخروی خسارہ کا ذریعہ بھی ہے۔ اللھم انا نعوذبک من ولد یکون علیّ وبالاً

قرآن مجید نے بڑی تاکید کے ساتھ ایمان والوں کو متنبہ کیا ہے کہ ’’اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو جہنم کی آگ سے بچاؤ‘‘ اس کا مطلب بالکل واضح ہے اپنے اور اپنوں کے ایمان واعمال کی فکر کرو، نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم ملا تھا کہ آپ اپنے اہل وعیال کو نماز کا اور اس پر ثبات قدمی کا حکم کریں۔ ایسے ہی نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم ملا تھا کہ ’’اپنے قریب ترین رشتہ داروں کو ڈرائیں‘‘ ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ اپنے اہل وعیال کی دینی تربیت کس قدر اہم امر ہے۔ لیکن بڑے افسوس کی بات ہے کہ آج ہم مسلمان اپنے بچوں کے ایمانی تحفظ کے لیے اتنی فکریں نہیں کرتے جتنا دشمنانِ ایمان اُن کے عقائد کے بگاڑنے کی کوشش اور کامیاب خفیہ تدبیریں روبہ عمل لا رہے ہیں؛ حالانکہ ایمان اساسِ اعمال ہے، اپنی اولاد کو کھلانے پلانے، پہنانے، دنیاوی تعلیم سے آراستہ کرنے، اور ان کے روشن مستقبل کی فکر کرنے سے کہیں زیادہ اُن کے ایمان کی حفاظت کرنا ضروری ہو گیا ہے، اگر ہم نہیں جاگیں گے تو ہماری نسلیں دنیاوی اعتبار سے قابل ترین تو بن جائے گی مگر خدانخواستہ ہزار بار خدانخواستہ ارتداد کا شکار ہونے کے واضح امکانات ہیں۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے بچوں کے دلوں میں ایمان کو راسخ کریں، فکر آخرت پیدا کریں، نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سچی محبت پیدا کریں، قرآن کی عظمت ان کے دلوں میں بٹھائیں، اس کے لیے کسی مستند عالمِ دین سے مخلصانہ تعلق رکھ کر اس سلسلے میں ان سے رائے مشورہ لیتے رہیں، مکتب کی تعلیم کو یقینی بنائیں اس کو غیر اہم نہ سمجھیں، جمعہ کے بیانات میں اپنے بچوں کے ہمراہ طالب بن کر اہتمام سے شرکت کریں، اپنے بچوں کے اسکول کا انتخاب باریک بینی سے کریں، بچوں کو دین بیزار دوستوں اور سوشل میڈیا کے غلط استعمال سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کرتے رہیں، علم، اہل علم سے سیکھنے یا دینی سوالات کسی مستند عالم دین سے پوچھنے کا اہتمام کریں اور اپنے بچوں کو کروائیں، دین کے معاملہ میں انٹرنیٹ سے مدد لینے سے بہت احتیاط کریں، گھر میں دینی ماحول بنانے کے لیے والدین کا دین پر استقامت کے ساتھ چلنا اہم ہوتا ہے اس لیے صبر وضبط کے ساتھ خود دین پر چلنے کا اہتمام کریں۔ کیوں کہ جو تربیت آنکھ کے ذریعے دیکھ کر ہوتی ہے وہ مؤثر ترین اور دیرپا ہوتی ہے

اللہ پاک ہماری اور ہماری نسلوں کے دین وایمان کی حفاظت فرمائے آخری سانس تک دین پر استقامت نصیب فرمائے اور خاتمہ بالخیر کی دولت سے مالا مال فرمائے۔ آمین

اللہ کو اعمال میں استقامت پسند ہے

از: مولانا مفتی محمد احمد علی قاسمی*

عَنْ عَائِشَةَ رضی اللہ عنہا أَنَّ رسولَ اللہ ﷺ قَالَ: سَدِّدُوْا، وَقَارِبُوْا، وَاعْلَمُوْا أَنْ لَّنْ يُدْخِلَ اَحَدَكُمْ عَمَلُهُ الْجَنَّةَ، وَأَنَّ اَحَبَّ الأَعْمَالِ اِلَى اللہِ اَدْوَمُهَا وَاِنْ قَلَّ (رواہ البخاری: 6464)۔

ترجمہ:۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: درمیانی چال اختیار کرو، قریب قریب رہو، اور جان لو کہ تم میں سے کسی کا عمل اس کو جنت میں نہیں داخل کر سکے گا، اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ عمل وہ ہے جس پر دوام وہمیشگی اختیار کی جائے؛ خواہ وہ تھوڑا ہی کیوں نہ ہو۔

تشریح: قرآن کریم کی بے شمار آیاتِ شریفہ میں اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانے کے بعد اوّلین درجے میں جس حکم وہدایت کا اہلِ ایمان کو پابند بنایا گیا اور اُسی پر فلاحِ اُخروی کا انحصار کیا گیا ہے وہ اعمالِ صالحہ کا اہتمام ہے، ان الذین امنوا وعملوا الصالحات کانت لھم جنٰت الفردوس نزلاً (سورۃ الکہف ۱۰۷) یہ اور اِس جیسی آیات سے ایمان کے ساتھ ''اعمالِ صالحہ'' کا التزام بآسانی سمجھا جا سکتا ہے، اعمالِ صالحہ کا وجود اور اس پر دوام واستمرار (جسے استقامت کے لفظ تعبیر کیا گیا ہے) زندگی بھر کا مجاہدہ ہے، جس کو اُجاگر کرنے کے لیے "رمضان" کا بابرکت مہینہ عطا کیا گیا، اور اس میں ایک خاص نورانی وملکوتی ماحول پیدا کر کے اعمالِ ایمان پر ابھارا گیا ہے، اس کی برکت سے رمضان کے مہینے میں ہر مسلمان کا دل نیک اعمال کی طرف نہ صرف راغب رہا؛ بلکہ اس کے وجود و قیام کے لیے بھر پور کوششیں اور محنتیں بھی کی گئیں، جس کا اثر سارے عالم کے مسلمانوں پر نمایاں طور پر نظر بھی آتا رہا ہے، سلوکِ ربانی وتربیتِ خداوندی کے اس عظیم ومقدس نظام کی برکت سے ملنے والی بیش بہا توفیقات کا تقاضا تو یہ تھا کہ رمضان کے بعد بھی عملی زندگی میں اُس کے اثرات عملی طور پر نمایاں رہتے؛ لیکن افسوس اور صد افسوس کہ جوں ہی ماہِ مغفرت ورحمت رخصت ہوا، اعمالِ صالحہ کا سلسلہ یکلخت معدوم ہو گیا،

* استاذ حدیث وفقہ ادارہ اشرف العلوم حیدرآباد

گویا کہ کایا ہی پلٹ گئی؛ اور رمضان سے پہلے جہاں تھے، وہیں رہے، نہ کچھ پانے کا احساس رہا، اور نہ کچھ کھونے کا شعور؛ حالاں کہ اعمال پر استقامت واستدامت ہی اللہ تعالیٰ کو پسند ہے، رسمی اور عارضی طور پر اعمال کی انجام دہی (یعنی کبھی کرنا کبھی چھوڑنا) خواہشِ نفس کی تکمیل تو ہوسکتی ہے لیکن للّٰہی عمل نہیں ہوسکتا؛ جب کہ اعمال کو قبولیت کے معیار تک پہونچانے کے لئے تسلسل اور دوام ایک لازمی امر ہے۔

ایک حدیث میں صحابیِ رسول حضرت سفیان بن عبداللہ ثقفی رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا: یارسول اللہ! مجھے اسلام کے بارے میں کوئی ایسی جامع اور شافی نصیحت فرما دیجئے، کہ آپ کے بعد کسی اور سے پوچھنے کی ضرورت باقی نہ رہے، آپ ﷺ نے فرمایا: کہو! میں اللہ پر ایمان لایا، پھر اس پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہو، قُلْ اٰمنتُ باللہِ ثُمَّ اسْتَقِمْ (مسلم:۱۵۹) معلوم ہوا کہ ایمان باللہ کے بعد ایمان اور اعمالِ ایمان پر "استقامت" ہی دینِ اسلام کی اصل غرض اور حقیقی روح ہے۔

''استقامت'' کا معنی ہے بلا افراط وتفریط اور بغیر کسی کجی اور انحراف کے اللہ کی مقرر کی ہوئی صراطِ مستقیم پر قائم رہنا، اور ہمیشہ اس کی ٹھیک ٹھاک پیروی کرتے رہنا، گویا تمام اوامر ونواہی اور جملہ احکامِ خداوندی کے صحیح مکمل اور دائمی اتباع کا نام استقامت ہے، اور ظاہر ہے کہ بندوں کے لیے اس سے آگے کوئی مقام ہی نہیں، اسی لیے بعض اکابر صوفیا نے فرمایا ہے: **الاستقامه خیر من الف کرامة**، یعنی استقامت ہزار کرامتوں سے بہتر اور بالاتر ہے، قرآن مجید میں بھی کئی جگہ انسان کی سعادت اور فلاح کو ایمان باللہ اور استقامت ہی سے وابستہ کیا گیا ہے، اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (معارف الحدیث ۱/۱۰۸)

حدیثِ مذکور میں بھی رسول کریم ﷺ نے اعمال میں اعتدال ومیانہ روی کو اختیار کرنے کے ساتھ ساتھ استقامت واستدامت کی اہمیت کی طرف اشارہ فرمایا ہے، کہ عمل وہی اللہ تعالیٰ کو محبوب وپسندیدہ ہے جس پر انسان کو استقامت حاصل ہو، اگرچہ کہ وہ مقدار میں تھوڑا اور کم ہی کیوں نہ ہو، اس لیے رمضان کے مہینے میں اعمالِ صالحہ کی جو توفیق اللہ تعالیٰ کی طرف سے حاصل ہوئی ہے، اس کی قدردانی کا تقاضا یہ ہے کہ اس کے تسلسل کو برقرار رکھا جائے، اور اعمال پر استقامت ہی کی برکت سے حق تعالیٰ سے امید کی جاسکتی ہے کہ ہمارے ایمانی درجات اور روحانی مقامات بلند سے بلندتر اور بالاتر ہوں۔

حق تعالیٰ ہمیں استقامت کی عظیم دولت سے سرفراز فرمائے آمین۔

پیش گُفتار

حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد نقشبندیؒ

الی رحمۃ ربہ العلی الاعلیٰ الوہاب

از: مدیر

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ وبہ أستعین

حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد نقشبندیؒ ۱۴؍ڈسمبر ۲۰۲۵ءکو اس دنیائے فانی سے دارِ آخرت کی طرف ہجرت کر کے عالمِ اسلام کو مغموم ومحزون چھوڑ گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

انہوں نے یکم اپریل ۱۹۵۳ءکو جھنگ کے ایک دین پسند گھرانے میں آنکھیں کھولی تھیں، دینی ماحول میں نشوونما پائی، تعلیم اصلاً عصری حاصل کی، اسی لائن میں معاشی مصروفیت اختیار کی، حافظِ قرآن تھے اور اسلامی علوم کی سند بھی رکھتے تھے، معاشی مصروفیت کے لئے اپنے تئیں ایک عمر مقرر کر لی تھی، اسی کے مطابق چالیس سال کی عمر سے آخر تک خالص دینی روحانی اور دعوتی زندگی بسر کی، متعدد ممالک کے سفر کئے، ہر جگہ ان کا فیض جاری ہوا، اور اب بھی جاری ہے۔

سلوک کا سلسلہ پہلے مفتی سید زوار حسین نقش بندیؒ سے شروع کیا، پھر ان کے بعد اسی سلسلہ کے شیخ حضرت غلام حبیب نقشبندی المعروف بہ مرشد عالم سے تکمیل کر کے اجازت وخلافت سے سرفراز ہوئے، ان کی اولاد کا بھی اصحابِ علم وفضل میں شمار ہے، اُن کے خلفاء سارے عالم میں پھیلے ہوئے ہیں، اور اپنے اپنے میدان میں نمایاں خدمات انجام دے رہے ہیں، اُن کی وفات کے بعد تمام خلفاء کے اتفاق سے ان کے بڑے صاحب زادے شیخ الحدیث حضرت مولانا حبیب اللہ صاحب زید مجدہم ان کی جانشینی کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

دنیا میں نہ کوئی رہنے کے لئے آیا ہے نہ آئے گا، اس دنیا میں اگر کسی کے ہمیشہ رہنے کی ضرورت تھی تو وہ خاتم الانبیاء حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات ستودہ صفات تھی مگر موت انھیں بھی آئی، جن کے رہنے کی دنیا کو سخت ضرورت تھی اور جن کا کوئی متبادل بھی مقدر نہ تھا جب اللہ تعالیٰ نے انہیں بھی طبعی موت سے گذار کر اپنے ہاں بُلا لیا اور امت مسلمہ نے اس حادثے کا تحمل کرلیا تو پھر ان کے بعد کون ایسی ہستی ہے جسے اپنی گوناگوں خوبیوں اور بے شمار خصوصیتوں کے باوجود اس دنیا سے رختِ سفر نہیں باندھنا ہے؟ جس کا اُٹھ جانا اور دنیائے فانی کو چھوڑ جانا امتِ مسلمہ کے لئے ناقابلِ تحمل ہو؟ جب کہ اس کے متبادل کا فراہم ہو جانا نظامِ قدرت کے مطابق ہر علاقے اور زمانے میں یقینی ہے۔ صحابہؓ کہتے تھے کہ جب نبی نہ ہوں گے تو ہم کیسے ان کے بغیر اس دنیا میں رہ پائیں گے، مگر نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جب وصال ہوگیا تو صدیقِ اکبرؓ کی زبانِ صدق سے نکلے ایک جملے نے تمام صحابہؓ کے جذبات ٹھکانے لگائے، اور سب کے سب راضی بہ رضائے الٰہی اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہوگئے" فمن كان منكم يعبد محمدا(ﷺ) فان محمدا قد مات، ومن كان منكم يعبدالله، فان الله حيٌّ لايموت" (بخاری: ۴۴۵۴) ہاں! جدائی کا طبعی رنج اور اس کا دل پر بوجھ یقیناً ایک فطری امر ہے اور اسے تسلیم و رضا کے ساتھ سہہ لینا مومن کی شان ہے۔

حضرت حکیم محمد اختر صاحب رحمہ اللہ نے اپنی اہلیہ کے انتقال پر عجیب حکیمانہ بات فرمائی تھی "ساٹھ سالہ رفاقت ختم ہوگئی، اب گھر میں قدم رکھنے کو جی نہیں چاہ رہا ہے، مگر کوئی میری بیوی کی عمر میں ایک لمحے کے اضافے کی پیشکش کرے تو میں اس کے لئے راضی نہیں ہوں، اس لئے کہ دنیا بھر کے عقلاء مل کر میری بیوی کی موت کا اچھا وقت مقرر کرنا چاہیں تو اس سے بہتر نہیں کر سکتے جو میرے مولیٰ نے مقرر کیا ہے"۔ سبحان اللہ! کیا ایمان و یقین کی بات فرمائی، پس ہم سب کو اپنے اکابر و مشائخ کی جدائی پر یہی طرز اختیار کرنا چاہیئے، البتہ اُن کے ذکر خیر کو مابعد والوں کی عبرت کے لئے تقریراً و تحریراً جاری رکھا جانا چاہیئے کہ یہ اہل اسلام کی ہدایت و استقامت کا سبب ہوتا ہے۔ بشرطے کہ وہ اطناب فی المدح اور غلو فی البیان سے محفوظ ہو، کیوں کہ ایسے تذکرے نافع بھی ہوں تو معصیت سے خالی نہیں ہوتے، جیسا کہ عام طور سے دیکھا جاتا ہے کہ اچھے اچھے اہل علم کی زبان و قلم بھی روشِ اعتدال سے پھسل جاتے ہیں۔ فالی اللہ المشتکیٰ

مجھ سے عزیزم سجود العزیز سلمہ العزیز مرتب "الفرقان" نے بہ اصرار چاہا کہ میں حضرت پیر صاحبؒ کے بارے میں کچھ لکھوں، مگر ایک تو اس لئے کہ وصال ان دنوں ہوا جب میں اختتامِ سال کی وجہ سے مسلسل جلسوں اور پروگراموں کی مشغولیت میں تھا، اور اس لئے بھی کہ یہ عاجز حضرت پیر صاحب رحمہ اللہ سے براہِ راست

استفادے اور قریبی واقفیت سے محروم ہے، کچھ لکھنے کی جرأت نہ کرسکا، مگران کی بار بار کی یاددہانی سے پھرخیال ہوا کہ چند سطور تحریر کردوں تاکہ کسی نیک بندے کے مرثیہ خوانوں میں میرا بھی شمار ہوجائے۔

حضرت پیر صاحب رحمہ اللہ کا نام سب سے پہلے میں نے اُن کے خلیفۂ اجل حضرت مولانا صلاح الدین سیفی صاحب مدظلۂ کے مرتب کردہ مواعظ ''دوائے دل'' کے ٹائٹل پر دیکھا تھا، پھراس کتاب کے مطالعے نے ان کی شخصیت کا احترام دل میں پیدا کیا، پھر جب ان کی خودنوشت روداد سفر ''لاہور سے تاخاکِ بخارا وسمرقند'' پڑھنے کا موقع ملاتو اُن کو پڑھنے، سننے، اور ملنے کی مزید تمنا پیدا ہوئی، اُن دنوں سی ڈیز کا چلن تھا، سفروں کے دوران ان کے بہت سے بیانات سُنے، دین کے ایک طالب علم ہونے کے حیثیت سے بعض روایات وواقعات پر خلجان کے باوجود اُن کے اندازِ بیان میں، سوزِ دروں میں، اور آواز والفاظ میں تاثیر کی طاقت محسوس ہوئی، شوقِ لقاء بڑھا اور اُنسیت ومحبت میں اضافہ ہی ہوتا رہا۔

اُن کا پہلا دورۂ ہند بہت پہلے اس وقت ہوا تھا جب وہ ہندوستان میں زیادہ متعارف نہیں تھے، اس سفر میں زیادہ تر گجرات کے مدارس نے ان سے استفادہ کیا، اور انہوں نے خود دیوبند اور دوآبے کے مراکز علم وعرفان کی زیارت واستفادے کا شرف حاصل کیا تھا، اسی سفر کے بیانات کو مولانا صلاح الدین سیفی مدظلہ نے بہت ہی سلیقے سے قلم بند کر کے شائع کروایا تھا، تب وہ جامعہ فلاحِ دارین ترکیسر کے استاذ تھے، اس کے بعد دوسرا سفر ہند حضرت مولانا محمود اسعد مدنی صدر جمعیت علماء ہند کی سعی جمیل سے بہت تفصیلی اور بہت بافیض رہا، اس وقت تک ہندوستان سے' میرے علم کے مطابق حضرت مولانا صلاح الدین سیفی مدظلۂ کے علاوہ حضرت مولانا خلیل الرحمٰن سجاد ندوی، ان کے اتباع میں مولانا شفیع ندوی مدظلہما اور حضرت قطب الدین مُلّا رحمہ اللہ حضرت پیر صاحب رحمہ اللہ کے دامنِ سلوک سے وابستہ اور اُن کے مُجاز ہوگئے تھے۔

حضرت پیر صاحب رحمہ اللہ اگرچہ ایک خالص روحانی واصلاحی شخصیت تھے، اُن کے بیانات بھی صرف انسانیت کی تعمیر اور سلوک کی تعلیم پر مبنی ہوتے تھے، وہ بندوں کواُن کے رب سے جوڑنے میں مدد کے علاوہ کسی اورعنوان پر بولتے بھی نہ تھے؛ مگراس کے باوجود ایک ایسے ملک کے متوطن تھے جو ہمارے ملک سے کٹ کے بنا تھا، اور اب ہمارا ملک سیاسی مصلحتوں کی بنیاد پر اُسے بالکل پسند نہیں کرتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ دونوں ملک کے باشندگان ایک دوسرے سے مانوس ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے دور رہنے میں عافیت محسوس کرتے ہیں، ان کے درمیان سیاسی رشتہ تو رہا ہی نہیں دینی اور خونی رشتے بھی انہیں آپس میں ملنے نہیں دیتے۔ ایسے میں حضرت پیر صاحب رحمہ اللہ کے سلوک وطریق سے عام ہندوستانیوں کا براہِ راست مستفید ہونا یا ملاقات کے

لئے اُن کے وطن جانا بہ حوالۂ احوال ممکن نہ تھا، پر اللہ کا دین آفاقی ہے، وہ علاقائی اور لسانی سرحدوں کو قبول نہیں کرتا، دین کی اسی آفاقیت نے ہند و پاک کی سیاسی چپقلشوں اور مصنوعی دشمنیوں کے باوجود ہندوستان کے طول وعرض میں اُن کے فیض کے پہنچنے کے ایسے مضبوط اسباب بنا دیے کہ بھارت کے چپّے چپّے کا ہر ہوش مند مسلمان کم از کم ان کے نام سے تو واقف ہوگا۔ نیز ملک کے مختلف علاقوں میں مصروفِ عمل اُن کے خلفاء کے ذریعے تو بلا شبہ ہزاروں علماء اور لاکھوں مسلمان اُن کے چشمۂ فیاض سے روحانیت کی پیاسِ جگر مٹا رہے ہیں۔ فللہ الحمد اولا و آخرا

حضرت پیر صاحب رحمہ اللہ کی دوسرے دورۂ ہند سے قبل میرے ایک دوست محترم حافظ ابرابر صاحب ـــــ جو دُبئی میں رہتے ہیں ـــــ نے اطلاع دی کہ حضرت اُن کے گھر مدعو ہیں، آپ بات کرلیں پھر فون اُن کو دے دیا تو سلام کلام ہوا، اس میں وہی مٹھاس چاشنی، انس واپنائیت جھلک رہی تھی جو ان کے مواعظ کی سی ڈیز میں میں نے سُن رکھی تھی، میں نے اُن سے کہا کہ سارے عالم میں آپ فیض پہونچا رہے ہیں ہمارے ملک کی طرف بھی نظرِ عنایت فرمائیے، ؎ اے ابر کرم بحر سخا کچھ تو ادھر بھی!

تو حضرت نے بہت خوشی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا میں بھی چاہتا ہوں کہ ہندوستان آؤں اور وہاں کے علماء کی زیارت و استفادہ کا موقع ملا، لیکن بات اسی خیر سگالی ٹیلی فونک گفتگو پر ختم ہوگئی۔

اس کے کچھ عرصے بعد پتہ چلا کہ حضرت مولانا محمود اسعد مدنی مدظلہ صدر جمعیت علماء ہند اُن کے سفرِ ہند کے لئے حکومتی سطح پر کوشش فرما رہے ہیں، چناں چہ یہ سعی مشکور ہوئی اور حضرت ہندوستان کے طویل دورے پر اپنی فیملی کے ساتھ رونق افروز ہوئے، بمبئی، گجرات، حیدرآباد، تمل ناڈو، دہلی، دیوبند ہر جگہ جانا ہوا، اور جہاں گئے انہیں دیکھنے اور سننے کے لئے عوام وخواص کا ایک ہجوم اُمڈ پڑا، جسے کنٹرول کرنا منتظمین کے لئے سخت دشوار بل کہ بے بس کر دینے والا ثابت ہوا، یہ سب غائبانہ طور پر سنے گئے ان کے مواعظِ حسنہ کا فطری اثر تھا۔

اسی سفر کے دوران ۱۵ / تا ۱۸ / اپریل ۲۰۱۱ء کا وقت خوش قسمتی سے حیدرآباد دکن کے لئے طئے پایا، چناں چہ ۱۵ / کی رات ۱۰ / بجے دہلی سے حیدرآباد ایر پورٹ پر پہنچے اور ۱۸ / کی شام ۵ / بجے چنئی یعنی مدراس کے لئے روانگی عمل میں آئی۔ حضرت مولانا خلیل الرحمٰن سجاد ندوی مدظلہٗ کی عنایت سے اس سفر کے نظام کا شرف اس عاجز کو حاصل ہوا، میں نے مناسب سمجھا کہ ایک اہم اور بیرون ملکی شخصیت کی میزبانی کسی ذمہ دار تنظیم کی جانب سے ہونا بہتر ہے، اور قیام بھی کسی ذمہ دار شخص کے پاس علماء کے مشورے سے طئے پانا چاہیئے، ورنہ پھر بدگمانی اور تنافس کو فتنے پھیلانے کا موقع مل جائے گا، چناں چہ علاقے کے اہل حق علماء کی سب سے قدیم اور معتبر تنظیم

''مجلس علمیہ'' سے اس پروگرام کی میزبانی کی درخواست کی گئی، اس وقت اس کے ناظم حضرت مولانا عبدالعزیز صاحب رحمہ اللہ رکنِ شوریٰ دارالعلوم دیوبند و جمعیت علماء ہند تھے، انہوں نے اس تجویز کو منظوری دی، اگر چہ حضرت کے تشریف لانے تک وہ اس دنیا میں نہیں رہے، لیکن ان کے بعد منتخب ناظم حضرت مولانا سید اکبر صاحب مفتاحی مدظلہ نے تمام انتظامات میں بھرپور سرپرستی فرمائی، اور یہ نازک ذمہ داری بہ سہولت انجام کو پہنچی، دو دن کے اس مختصر وقفے میں حضرت کے چھ پروگرام طئے کئے گئے تھے، ان نورانی اور روحانی پروگراموں سے پوری ریاست اور اطراف واکناف کی ریاستوں سے ہزاروں مسلمانوں نے اور علماء کرام نے استفادہ کیا، حضرت بہت خوش تشریف لائے اور بمسرت واپس ہوئے۔ میں نے اس سفر کی مختصر مگر جامع روداد مرتب کی تھی جو الفرقان میں جولائی ۲۰۱۱ء کے شمارہ میں چھپ چکی ہے۔

اس سفر میں منتظم سفر کی حیثیت سے حضرتؒ مجھ سے متعارف ہو چکے تھے، اس لئے حیدرآبادی احباب کے ذریعے سلام و دعا کا سلسلہ برابر جاری رہا، عمرہ کے سفروں میں دوسروں کی طرح مجھے بھی ملاقات کا شرف حاصل ہوتا رہا، اگر چہ اِس آخری عرصے میں نہ میری حرمین شریفین حاضری ہوسکی نہ حضرتؒ سے تازہ ملاقات ہوسکی، پھر تو وہ خود بھی سفر کے لائق نہ رہے، زیادہ بیماری کی خبریں بھی آنے لگی تھیں۔

ایک سفر عمرہ میں رات دیر گئے دورانِ سعی ایک بڑا گروپ مرد و خواتین کا نظر پڑا تو سوچا کہ کسی بزرگ کا قافلہ ہوگا، غور سے دیکھا تو آگے وھیل چیر پر حضرت پیر صاحبؒ نظر آئے، جب وہ مروہ پہاڑی پر دعا کے لئے رُکے تو میں آگے بڑھ کر سلام کیا اور اپنا نام بتلایا، فوراً معانقہ کیا اور ساتھیوں کی طرف دیکھ کر فرمایا، یہ مولانا عبد القوی ہمارے حیدرآباد کے میزبان ہیں، پھر دیر تک دعائیں دیتے رہے، میزبان تو حیدرآباد میں مجلسِ علمیہ تھی لیکن چوں کہ اس وقت اس کے نائب ناظم ہونے کی وجہ سے انتظامات میرے ذریعہ ہو رہے تھے اس لئے حضرت نے یوں ارشاد فرمایا، مجھے حضرتؒ کی یادداشت اور اعتراف سے بہت سبق ملا۔

ایک مرتبہ پچھلی پہر وہ مطاف میں بیٹھے خانۂ کعبہ کی دیدار میں مگن تھے، میں جا کر سلام کیا اور نام بتایا تو بہت خوشی کا اظہار فرمایا، فوراً ہاتھ اُٹھا کر تھوڑی دیر تک دعائیں دیتے رہے، پھر اپنے ایک ساتھی سے فرمایا کہ انہیں مطاف کے تاریخی مقامات دکھادو، انہوں نے فرش پر موجود کچھ علامات کے حوالے سے قدیم زمانے کے مطاف کا نقشہ کھینچا، اچھی معلومات حاصل ہو کر خوشی ملی، یہ ان کی کرم فرمائی تھی۔

ایک سفر میں پتہ چلا کہ پڑوس کی ہوٹل میں ان کا قیام ہے، اور عصر بعد مجلس ہوگی تو مجلس میں شریک ہونے کا موقع ملا، اس مجلس میں چوں کہ حضرتؒ کے رفقاء کی بڑی تعداد تھی اس لئے عمرے کے ضروری احکام قولاً وفعلاً

عام فہم انداز میں بیان کئے گئے تھے ، بعد میں اجازت لے کر ان کے روم پر بھی گیا ، ایک ضخیم کتاب ان کے دروس پر مشتمل ___ جو کسی حدیث کے مشمولات کو غالباً بیس دن میں بیان فرمایا گیا تھا ___ یہ کہہ کر عنایت فرمائی کہ علماء کو اس میں بیس جمعوں کے خطاب کا مواد مل جائے گا۔

ایک اور سفر میں میرے شاگرد نے بتلایا کہ فلاں ہوٹل میں حضرت کا قیام ہے، اور عصر بعد ملاقات ممکن ہے، وہی ساتھ لے گئے اور اطلاع بھی انہوں نے ہی دی، حالاں کہ کئی معروف علماء انتظار میں تھے، حضرتؒ نے فوراً تنہا اس عاجز کو بلالیا، ضیافت فرمائی، میں دوسرے منتظرین کی وجہ سے جلد اُٹھ جانا چاہتا تھا مگر حضرتؒ دس منٹ تک مشرقِ وسطیٰ پر اسرائیلی جارحیت ، بدنیتی اور سلاطین عرب کی مجبوریاں تاریخی حقائق اور مضبوط و موثوق معلومات کی روشنی میں بیان فرماتے رہے، جو کم از کم میرے لئے نئی اور چشم کشا معلومات تھیں، اور جو بعد کے تمام احوال میں بعینہ نظر بھی آ رہی ہیں۔

یہ تو بالمشافہ ملاقاتوں کی باتیں تھیں خوابوں میں بھی زیارتیں ہوتی رہیں، مگر اُن کی تفصیل ذہن میں نہیں ؛ البتہ ایک مرتبہ خواب میں ان کی زیارت حرم شریف میں ہوئی، جس میں وہ مجھ سے فرمارہے تھے کہ بچوں کے لئے اسکولوں سے آنے کے بعد دین کی تعلیم کا اچھا انتظام کرنے کی سخت ضرورت ہے، اس کا بہتر نظام بنایا جائے ۔ بیداری کے بعد دل پر اس کا بڑا اثر رہا، جس بات کی طرف انہوں نے توجہ دلائی تھی واقعی وہ امت کی اہم ترین ضرورت ہے، بالخصوص ہندوستان کے موجودہ حالات میں تو بچوں کی دینی تعلیم و تربیت کا کام ہر کام کی ضرورت پر فوقیت لے گیا ہے۔ اللہ پاک تمام علماء کو توجہ کی توفیق دے، آمین۔

جہاں تک حضرت کی تصنیفات کی تاثیر کا معاملہ ہے تو ان کا لٹریچر ان کی تقریروں ہی کی طرح جاذب ومقبول ثابت ہوا، کمانے والوں نے بھی اُنہیں چھاپ چھاپ کے خوب کمایا اور استفادہ کرنے والوں نے بے حساب فائدہ اُٹھایا، کتنے نوجوان سدھرے، کتنی زندگیاں بدلیں، کتنی خواتین غفلت سے جاگیں، اس کا اندازہ لگانا بھی مشکل ہے، ہر گھر اور ہر مکان میں کچھ نہ کچھ ان کا لٹریچر نظر آ ہی جاتا ہے، حد تو یہ ہے کہ جب میں تقدیرِ الٰہی سے جیل کی زندگی گذار رہا تھا، شروع شروع میں تو مجھ سے کسی کو ملنے کی بھی اجازت نہیں تھی، لیکن دھیرے دھیرے جیلروں نے نرمی برتنی شروع کی تو دیگر قیدی ملنے کے لئے آنے لگے، میں ہر ایک سے کہتا تھا کہ کسی بھی بیراک میں کوئی دینی کتاب ملے تو لا کے دو، مگر سب بے ذوق اور بے تعلیم لوگ تھے، جیل میں ایک قاری صاحب بھی کافی عرصے سے قید تھے، اُنہیں معلوم ہوا تو انہوں نے ایک کتاب بھجوائی، یہ پہلی کتاب جو ہاتھ لگی تو حضرت پیر صاحبؒ ہی کی کتاب تھی، پھر ایک اور کتاب کسی نے لا کر دی تو وہ بھی انہی کی تصنیف تھی، میں نے جیل

کی فرصت میں دونوں کا بہت دل چسپی اور گہرائی سے مطالعہ کیا، اس کی تفصیل جیل میں لکھی گئی اپنی ڈائری ہی سے ہدیۂ ناظرین کرتا ہوں کہ شاید کام آئے۔ وھو ھذا

''انہی دنوں قاری صاحب نے حضرت پیر ذوالفقار احمد نقشبندی دامت برکاتہم کی کتاب ''اسلاف کے حیرت انگیز واقعات'' مطالعے کے لئے پہونچائی، یہ کتاب اکابر دیوبند کے واقعات پر مشتمل ہے، اکابر دیوبند ہماری آنکھوں کے تارے اور ہمارے قلوب کا سرور ہیں، یہ واقعات زیادہ تر بار بار کے پڑھے اور سنے ہوئے تھے مگر پھر بھی دلچسپی سے پڑھے گئے کہ

گر تو خواہی تازہ داشتن زخمہائے سینہ را
گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

ان واقعات سے سبق بھی ملا، ہمت بھی آئی اور ان حضرات کے اخلاص وایثار، خوفِ خدا وتعلق مع اللہ پر دل تڑپا اور آنکھیں روتی رہیں، کتاب میں ٹائپ کی بہت سی غلطیاں تھیں، کہیں کہیں کوئی لفظ چھوٹ گیا تھا، میں نے ان کی تصحیح بھی ساتھ ساتھ کی کہ دیگر پڑھنے والوں کو سہولت رہے، یہ کتاب ختم ہونے سے قبل ہی انہوں نے پیر صاحب ہی کی ایک اور کتاب ''حیا اور پاک دامنی'' لاکر دی، اس کتاب کو بھی مکمل پڑھا، یہ کتاب البتہ اہتمام سے تصحیح ہوکر چھپی ہوئی ہے، مطالعے کے دوران مجھے بعض عربی عبارات یا آیات کے تراجم سے اطمینان نہ ہوا تو حاشیہ میں نشاندہی کردی، اس طرح موضوع سے متعلق کہیں کہیں کوئی اور بات بزرگوں کی یاد آگئی تو وہ بھی حاشیے پر تحریر کردی، میرے خیال میں نہایت عرق ریزی اور کافی دل چسپی وسوزِ دروں کے ساتھ لکھی گئی حضرت پیر صاحب رحمہ اللہ کی اس کتاب کا جواب نہیں، نہایت مؤثر ہے، لیکن باب نمبر پانچ اور چھ سب کے لئے مفید نہیں معلوم ہوئے، حضرت پیر صاحب چوں کہ عصری تعلیم یافتہ بھی ہیں اور نوجوانوں کے بگاڑ کے اسباب سے اچھی طرح واقف ہیں، اسی کی روشنی میں بعض باتیں مثلاً کس طرح لڑکے لڑکیوں کو مرحلہ بہ مرحلہ گرفتارِ عشق کرکے انہیں بقدر ضرورت استعمال کرتے پھر راندہ کردیتے ہیں، یہ عنوان بہت تفصیل سے بیان کیا ہے، نیز ان سائٹس کی بھی نشاندہی فرمائی جن سے خود بچنا اور بچوں کو بچانا ضروری ہے، اگرچہ اِن کے بیان سے حضرت کا منشاء سالکین کے ساتھ انتہائی خیر خواہی ہی ہے، مگر ہم جیسے نام کے سالکین سے اندیشہ ہے کہ نفسِ امارہ الانسان حریص لما منع کے مصداق ان امور کی طرف راغب کرلے، کچھ ضروری نہیں کہ میرا یہ خیال صحیح ہو مگر تأثرات شخصیہ نوکِ قلم پر آگئے، بڑوں کی شان میں سوءِ ادب سے اللہ محفوظ رکھے۔''

جیل کا یہ واقعہ حضرت پیر صاحبؒ کے فیوض کی وسعتوں کو بیان کرنے کے لئے لکھ دیا کہ آزادوں سے

لے کر قیدیوں تک اور مسجدوں، مدرسوں گھروں سے لے کر جیل خانوں تک اللہ جانے کہاں کہاں تک اُن کے دردوکُڑھن کی آوازیں سنی جاتیں اور یادگاریں پہنچتی ہیں، ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَّشَاءُ

یہ چند باتیں ہیں جو حضرتؒ کے حوالے سے ذہن میں آگئیں اور سپردِ قرطاس کر دی گئیں، باقی پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ مجھے اُن کی زیادہ مجالست وملاقات کی سعادت نصیب نہیں ہے۔بس غائبانہ عقیدت، عالمی اثرات کا اعتراف اوران کے بعض ہندوستانی خلفاء کی قابل قدر ولائقِ تحسین خدمات نے ہمیشہ حسنِ ظن اور ذکر خیر پر ہی آمادہ رکھا۔اورکون ہوگا جوزمانے کے احوال پرنظر رکھتا ہواور وہ اصلاحِ امت کے باب میں حضرت پیر صاحبؒ کی خدماتِ جلیلہ اورقبولیتِ عامہ کا انکارکرے، یہ حقیقت ہے کہ اس صدی کے مصلحینِ اُمت میں عالمی طور پرعوام وخواص کے اندر جوشہرت وقبولیت اللہ نے انہی دی تھی وہ شائدہی کسی اورکوحاصل ہوئی ہو،خودسلسلۂ عالیہ نقشبندیہ کا اس وقت جو عالم گیر چرچاہے بالخصوص برِصغیر میں وہ تاریخِ نقشبندیت کا سنہرا باب کہلانے کے لائق ہےیعنی تاثیروتوسیع اورشہرت وقبولیت کے اعتبار سے۔جہاں تک محققینِ فن اورمجددینِ وقت کا سوال ہےتو یقیناًاوربھی شخصیات قابل ذکر ولائقِ شمارہوسکتی ہیں بل کہ ہیں۔

ایک وقت تھا جب برصغیر کا ہرگوشہ مساجد کے ساتھ خانقاہوں سے آراستہ تھا، جدھر دیکھوسلاسلِ اربعہ کی سلسبیلیں بہہ رہی تھیں،لوگ جوق درجوق ان سبیلوں سے مستفید ومستفیض ہورہے تھے،مشائخ ہی کے ہاتھوں میں زمامِ دین تھی ،لیکن رفتہ رفتہ للٰہیت کے ان مرکزوں پرنفسانیت کی سرکش بجلیاں گرنے لگیں، پھرکیا تھا یہ مراکزِ ہدایت مراکزِ بدعت وضلالت میں تبدیل ہوتے چلے گئے،اللہ تعالیٰ نے کچھ ڈھیل دینے کے بعدتصوف کے نام پرجاری اس جہل مرکب کے خاتمہ کا ارادہ فرمایا،اورشیخ احمدسرہندیؒ سے لے کراکابردیوبند تک مجددین طریق کی ایسی ہستیاں پیدافرماتا چلا گیا جنھوں نے جوگیت سے متاثر اورآزادمزاج تصوف کوشریعت وسنت کے دائرہ میں محدوداور پابند بنانے کی تحریک چلائی،اوراس میں بفضلِ الٰہی کامیاب ہوئے۔انہوں نے امت پرواضح کیا کہ تصوف وسلوک کوئی مستقل دین یا خدا کے رازہائے سربستہ کا نام نہیں،محض ظاہروباطن کو پابند شریعت بنانے اوراخلاقِ رذیلہ کواخلاقِ حمیدہ سے بدلنے کی سعی کا نام ہے۔

اس تجدیدی کارنامے کا اتنا خوش گوار اثر پڑا کہ پھرپورے برصغیرمیں تعمیر الظاہر والباطن کی فکروں کی بادِبہاری چل پڑی، ایسے ایسے صالح وکامل نفوس علماءوعوام دونوں میں سے نکل کرسامنے آنے لگے جن کے تدین وتقویٰ کو دیکھ کرصحابۂ کرام کی یادتازہ ہونے لگی، اخیرمیں قافلۂ امداداللٰہی نے بالخصوص اس میں سے حضرت تھانویؒ نے تصوف وطریقت کوکتاب وسنت کے رنگ میں اس طرح رنگ دیا کہ اس کی مشروعیت کا کوئی

منکر انکار نہیں کرسکتا اور اس کی ضرورت سے کوئی مومن مستغنی نہیں ہوسکتا۔ فجزاھم اللہ احسن الجزاء

اسی کے بعد علماءِ دیوبند جامع شریعت وطریقت ہونے کے امتیاز سے سارے عالم میں ممتاز قرار پائے۔ لیکن یہ بات بہت ہی تلخ مگر سچ ہے کہ شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا کاندھلویؒ کے بعد یہ جامعیت مرورِ زمانہ کے ساتھ علماءِ دیوبند میں بھی کم زور پڑتی چلی گئی، بہت سے علماء کا اس طرف رجحان ہی ختم ہوگیا تھا بل کہ شریعت وطریقت کو جمع کرنے کی ضرورت سے انکار بھی ہونے لگا تھا، ایسے میں حضرت پیر صاحبؒ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے سلسلۂ نقشبندیت کی ایک ایسی بادِ نسیم چلائی جس نے برصغیر کے عوام وخواص کو اپنی جانب متوجہ کرلیا، مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد میں تصوّف وطریقت یا پیری مریدی کا شعور جاگا یا کم از کم جمود ٹوٹا، گذشتہ پچیس تیس سال میں آئی ماحول کی یہ تبدیلی چشمِ سر سے دیکھی جاسکتی ہے، یقیناً اس اثناء میں بہت سے اکابر ومشائخ خاموشی کے ساتھ اپنا کام جاری رکھے ہوئے تھے اور جاری رکھے ہوئے ہیں، اُن میں سے بعض کے فیوض اور برکات واثرات تو عالمی نوعیت کے ہیں، میں اُن سے بے خبر ہوں نہ منکر ہوں، نہ تقابل وتفاضل کے جہل میں مبتلا ہوں، بس پیر صاحبؒ کے حوالے سے بات کررہا ہوں تو جو میرا مشاہدہ یا تاثُّر ہے اُسے ضبطِ تحریر میں لارہا ہوں کہ جس تیزی سے عوام وخواص کا ایک جمِ غفیر اُن کی جانب مائل ہوا یقیناً تائیدِ الٰہی کے بغیر ممکن نہیں ہے، محض عوام اور جہلاء کا میلان ہوتا تو الگ بات تھی، یہاں اصحابِ علم وفضل کی بڑی تعداد معترفِ تاثیر ہے اور غایتِ عقیدت کے ساتھ اُن سے منسلک ہے۔

اخیر میں تمام ہی سلسلوں کے مُجازینِ مشائخ اور مجاورینِ خوانق سے گذارش ہے اگر چہ بے جا جسارت ہے؛ مگر ضرورت محسوس کرکے اور اپنی اوقات دھیان میں رکھتے ہوئے دست بستہ اور سائلانہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ مثل مشہور ہے ''جب تالاب کی گیرائی بڑھ جاتی ہے تو گہرائی کم ہوجاتی ہے'' خدارا تصوف وسلوک کے اس تالاب کو جو دن بہ دن پھیلتا چلا جارہا ہے گہرائی سے محروم ہونے سے بچالیجئے، تصوف جیسے عمیق اور گہرے دریا میں سطحیت ورسمیت اگر آجائے گی ـــــ جس کے اثرات نظر آنے لگے ہیں ـــــ تو ملت کا اس سے بڑا خسارہ کوئی اور نہ ہوگا، اگر خانقاہوں اور مشائخ سے جڑ کے بھی خدا کو نہ پاسکے تو خدا کو پانے کے لئے ہم اور کہاں جاسکیں گے؟ اگر احسان وسلوک کے راستے سے بھی شہرتوں اور نسبتوں کا ذوق نہ مٹ سکا تو عبدیت وفنائیت کی دولت کہاں سے لاسکیں گے؟ اگر کسی مُرشد کا دامن تھامنے کے بعد بھی شخصیت سازی، کردار کی بلندی، اور نفس کُشی کا سلیقہ نہ مل سکا تو پھر ان مقامات کی تحصیل کی صورت کیا ہوگی؟ اگر تصوف نے بھی ہمیں ایک دوسرے کے احترام، حقد وحسد سے اجتناب، حلم وتحمل کا مزاج رواداری ویکجہتی کی صفات نہیں دیں تو ملت اتحاد واُخوت کا نبوی سبق لینے

کے لئے آخر کہاں جائے گی ؟ ان پہلوؤں سے آج کے مشائخ اور مریدین دونوں کو بہت زیادہ سوچنے کی ضرورت ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ سلوک واحسان کا راستہ ہے ہی بہت سادہ ،جتنی سادگی اور بے تکلفی ہوگی اتنی ہی آسانی سے مدارجِ سلوک طئے ہوتے چلے جاتے ہیں اور جتنا تکلف و تصنّع بڑھتا جاتا ہے اتنا ہی مقاصد ومنافع سے محرومی مقدر ہوتی رہتی ہے۔ العیاذ باللہ!

بہ طور خاص میں حضرت پیر صاحبؒ کے تمام خلفاءِ عظام وذی احترام سے ادباً گذارش کرر ہا ہوں کہ امت کا ایک بڑا طبقہ آپ کے پالے میں ہے، حضرت پیر صاحبؒ کی کشش سے لاکھوں خواہش مندانِ تربیت اور متلاشیانِ خدا نے اپنے قلوب آپ کے حوالے کردیئے ہیں ،لیکن اس زمانے میں ہر جگہ مریدین کا ایک بڑا طبقہ طلبِ صادق سے محروم ہے بہت سوں کے نزدیک بیعت سے سلسلے میں شرکت کے علاوہ کوئی غرض نہیں ہے، بعض اسے اغراضِ دنیویہ کے حصول اور مصائب ومسائل کا حل سمجھتے ہیں ،بعض کو اذکار واوراد اور معمولات کی حد تک دل چسپی ہے ،بعض تو حصولِ اجازت وخلافت کی چاہت میں اظہارِ عقیدت ومحبت کرتے پھرتے ہیں، باقی ایک چھوٹا سا طبقہ اللہ والوں سے اللہ کو پانے کے لئے صدقِ طلب کے ساتھ جڑا ہوا ہے اگر چہ طریق کی تفہیم اسے بھی نہیں ہے، البتہ وہ صدقِ طلب کی برکتوں سے محروم بھی نہیں ہے۔

آپ حضرات کا ماشاء اللہ سے خود بھی ایک وفاق ہے اور سالانہ اجتماع بھی ہوتا ہے، گذارش ہے کہ اس میں طالبین کی فکری ،علمی ،عملی ،اور باطنی تعلیم وتربیت کے دروس اس طرح ہوں کہ ضروری عنوانات کا احاطہ ہوجائے ،تاکہ مختلف علاقوں مزاجوں کے خلفاء ہونے کے باوجود تعلیم وتربیت میں عبوری یکسانیت پیدا ہوکر انوارِ سلوک اور اثمارِ طریق ان لاکھوں وابستگانِ سلسلہ اور تشنگانِ اصلاح وتزکیہ تک بہ آسانی پہنچ سکیں ، یہ مری ایک تمنا ہے جو بے ساختہ نوکِ قلم پر آگئی ، میں ملک کے مسلمانوں کے لئے قلیل البضاعۃ فی العلم والعمل ہونے کی وجہ سے خود تو کچھ نہ کرسکا، جی چاہتا ہے کہ آپ حضرات کے ذریعہ سلوک واحسان کا یہ مبارک عمل ضائع ہونے یا رسم بن کررہ جانے سے بچ جائے ،امتِ مسلمہ ہندیہ اس وقت واقعی بہت قابلِ رحم حالت میں ہے، اللہ پاک فضل فرمائے۔ آمین۔

یہ بالکل سچی بات ہے کہ آج بعد نمازِ فجر اس تحریر کو مکمل کرتے کرتے تھوڑی دیر کے لئے لیٹ گیا تو آنکھ لگ گئی، پھر کیا دیکھتا ہوں کہ محبوب العلماء والصلحاء حضرت پیر صاحب رحمہ اللہ میرے کمرے میں دروازہ کھول کر اچانک داخل ہوئے ، وہی قد وقامت ، وہی حسن و جمال ، وہی ضخیم پگڑی ایک دم سفید اور نورانی لباس میں ملبوس مسکراتے ہوئے کھڑے ہیں، میں گویا لکھنے میں مشغول ہوں ، دیکھتے ہی قلم رکھ کر کھڑا ہوگیا، مصافحہ کے بعد

معانقے کے لئے بڑھا تو دیکھا کہ وہ حالتِ احرام میں ہیں، تخت پر بیٹھنے کے لئے عرض کیا تو بیٹھ گئے، پیچھے اسی قدوقامت کے ایک آدھ خدام بھی نظر آرہے تھے، اُن سے فرمانے لگے: وہ چادر دو جو مولانا کے لئے لایا تھا، ان لوگوں نے ایک بیاگ یا پالی تھین آگے بڑھائی، حضرتؒ اس میں تلاش کر کے کچھ نکال رہے تھے اور میں اس مبارک تحفے کو لینے کے لئے سراپا انتظار اور مسرور تھا کہ آنکھ کھل گئی، پھر کمرے میں ایسے لگ رہا تھا کہ واقعی وہ ابھی ملاقات کر کے گئے ہیں، دیر تک ایک قسم کی بشاشت اور لذت محسوس ہوتی رہی، فللہ الحمد۔ میں اس خواب کو اپنے حق میں بشارت سمجھ رہا ہوں کہ اہل اللہ کی روحانیت متوجہ ہے، اوران سطور کے بے مایہ راقم کے پاس اِن امانی کے علاوہ ہے بھی کچھ نہیں۔

اسی تازہ خواب کو تحریر کرنے کے بعد اپنی بے ڈھنگی باتیں ختم کرتا ہوں، مجھے یقین ہے کہ الفرقان جیسے مؤقر ماہنامے اور اس میں لکھنے والے نام ور اہل قلم کے مضامین کے ساتھ یہ تحریر شامل ہونے کے لائق تو نہیں مگر جب مرتب کے تقاضے پر لکھ ہی دیا ہے تو بھیج بھی دے رہا ہوں۔

میری دلی دعا ہے کہ حق تعالیٰ حضرت پیر صاحب رحمہ اللہ کی مغفرت فرمائے، اعلیٰ علیّین میں جگہ عطا فرمائے، ان کے لگائے اس باغ طریقت کو ہمیشہ سدا بہار رکھ کر ان کے لئے صدقہ جاریہ بنا دے۔ آمین یارب العالمین۔

گوشۂ خواتین

اسلام کی باکمال خواتین

حضرت ہالہ بنت خویلدؓ

(حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کی بہن)

از: مولانا مفتی رفیع حنیف صاحب قاسمی*

نام ونسب

یہ نامور صحابیہ حضرت خدیجۃ الکبری رضی اللہ عنہا کی حقیقی بہن ہیں اور آقائے دو جہاں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بڑے داماد حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے شوہر ابوالعاص بن ربیع کی والدہ محترمہ ہوتی ہیں۔ ان کا سلسلہ نسب کچھ اس طرح ہے: ”ہالہ بنت خویلد بن اسد بن عبدالعزی بن قصی“۔

(أسد الغابۃ: ہالہ بنت خویلد: ۷ر ۲۷۴، دارالکتب العلمیۃ، بیروت)

قبول اسلام

وہ مشرف بہ اسلام ہوئیں، اور حضرت خدیجہ الکبری رضی اللہ عنہا کے بعد بھی بقید حیات رہیں۔

نکاح

ان کا نکاح ربیع بن عبدالعزیٰ (بن عبد شمس بن عبد مناف بن قصی) سے ہوا تھا، ان کے صلب سے ہی ابوالعاص پیدا ہوئے جن سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صاحبزادی حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا نکاح ہوا، اس طرح حضرت ہالہ کو اللہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سمدھن بننے کا بھی شرف حاصل تھا، حضرت خدیجہ الکبریٰؓ اپنے بھانجے ابوالعاص سے بے حد محبت کرتی تھیں اور ان کو اپنا فرزند شمار کرتی تھیں۔

حضور کی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خدمت میں

ایک دفعہ حضرت ہالہؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت اقدس میں بغرض ملاقات مکہ سے مدینہ منورہ آئیں،

* استاذ فقہ وادب: ادارہ کہف الایمان ٹرسٹ، بورہ بنڈہ، حیدرآباد

بارگاہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں پہنچ کر اندر آنے کی اجازت طلب کی، ان کی آواز حضرت خدیجۃ الکبری رضی اللہ عنہا کی آواز سے ملتی تھی، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سماعت مبارک میں ان کی یہ آواز پہنچی تو بے ساختہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حضرت خدیجۃ الکبری رضی اللہ عنہا کی یاد آ گئی، اللہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے یہاں تشریف فرما تھے، آپ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے گویا ہوئے: ''خدیجہ رضی اللہ عنہا کی بہن ہالہ ہوں گی'' ''اللهم هالة'' پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن کا تپاک سے استقبال کیا، اور ان کی بے حد تعظیم و تکریم کی۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ مجھے بڑی غیرت آئی میں نے کہا: آپ کیا قریش کی ایک بوڑھیا کا کیا تذکرہ کرتے رہتے ہیں؟ جس کا زمانہ جاہلیت میں انتقال ہو چکا، جب کہ اللہ عزوجل نے ان سے بہتر بیوی آپ کو عطا کی ہیں''۔ ما تذكر من عجوز من عجائز قريش حمراء الشدقين هلكت في الدهر، قد أبدلك الله خيرا منها (معرفۃ الصحابۃ لابن نعیم، ہالۃ بنت خویلد: ۶/ ۳۴۶۳، دار الوطن للنشر، الریاض)۔

اور بعض روایات میں یہ بھی الفاظ ہیں اس وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے اس کلام کو سن کر اس قدر جلال میں آ گئے کہ آپ کی پیشانی کے بالوں کے پاس (غصے کی لہر) ظاہر ہونے لگی، پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اللہ کی قسم! اللہ نے مجھے ان سے بہتر کوئی بدل عطا نہیں فرمایا، وہ اس وقت مجھ پر ایمان لائیں جب لوگوں نے کفر کیا، انہوں نے میری اس وقت تصدیق کی جب لوگوں نے مجھے جھٹلایا، انہوں نے اپنے مال کے ذریعے میری اس وقت غمخواری کی جب لوگوں نے مجھے محروم کر دیا، اور اللہ نے مجھے ان سے اولاد عطا فرمائی جب کہ دوسری بیویوں سے مجھے اولاد نہیں ملی'' و رزقني الله عز و جل ولدها إذ حرمني اولاد النساء''

(مسند احمد، ذکر عائشۃ الصدیقۃ: حدیث: ۲۴۸۶۴)

وفات

حضرت ہالہ رضی اللہ عنہا کی سنِ وفات اور دیگر احوال کا کتب تاریخ و سیر و مناقب میں ذکر نہیں ملتا۔

اصلاحی مضامین

دینی خدمت گذار اور عام مسلمانوں کی ذمہ داریاں!

از: حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی مدظلہ *

اللہ تعالیٰ نے ہمیں جن نعمتوں سے نوازا ہے، وہ دو طرح کی ہیں: ایک: مادی نعمتیں، جن میں کھانا، کپڑا، علاج اور مکان کو بنیادی اہمیت حاصل ہے، دوسرے: روحانی نعمت، اور وہ ہے اسلام، یہ روحانی نعمت عالم آخرت میں تو ہماری کامیابی اور نجات کا ذریعہ ہے ہی، اس دنیا میں بھی ہماری ضرورت ہے، اور زندگی کے ہر مرحلہ میں ہمیں اس سے روشنی حاصل ہوتی ہے، ہمیں کیا کھانا چاہئے اور کیا نہیں کھانا چاہئے؟ ہمارے لباس میں کن باتوں کی رعایت ہونی چاہئے؟ بال بچوں کے ساتھ، والدین کے ساتھ، شوہر اور بیوی کا ایک دوسرے کے ساتھ کیا رویہ ہونا چاہئے؟ ہمارے ایک دوسرے پر کیا حقوق ہیں؟ معاملات میں ہم کس طرح صفائی اور شفافیت کو برقرار رکھیں اور معاشرہ کو ظلم و ناانصافی سے بچائیں؟ یہ سب ہمیں مذہب ہی سے معلوم ہوتا ہے، غرض کہ شائستہ و مہذب زندگی اور انصاف پر مبنی سماجی تعلقات کے لئے انسان ہر لمحہ اپنے خالق و مالک کی رہنمائی کا محتاج ہے، اور اسلام کے ذریعہ ہمیں یہ رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔

ہماری زیادہ تر جدوجہد کا محور موجودہ زندگی کی راحتوں اور آسائشوں کا حصول ہے، اور اگر یہ کوشش شریعت کی مقرر کی ہوئی حدوں میں ہو تو اس میں حرج نہیں، اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ہی دنیا کے تمام کاروبار بلا وقفہ جاری و ساری ہیں؛ تاہم ہماری زندگی میں دین کو قائم رکھنے کے بنیادی طور پر دو مراکز ہیں: مسجدیں اور مدرسے، مسجدیں اصل میں تو مسلمانوں کے ہمہ مقصدی مراکز ہیں، عہد نبوی میں مسجدیں تعلیم گاہ بھی تھیں، اور صلح سینٹر بھی تھیں، جس میں مسلمانوں کے باہمی اختلافات طئے کیے جاتے تھے، یہیں عدالتیں قائم ہوتی تھیں اور ہر طرح کے فیصلے ہوتے تھے، امور سلطنت پر مشورے ہوتے تھے، جنگ و امن کے فیصلے کئے جاتے تھے، غرض کہ مسلم سماج اور اسلامی مملکت کے تمام ضروری اُمور یہیں طئے ہوا کرتے تھے، آہستہ آہستہ مسجدوں کی یہ ہمہ گیر خدمت محدود ہوتی گئی؛ لیکن اب بھی یہ مسلم سماج کا ایک اہم مرکز ہے، اور کم سے کم چار

* صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ

ضروری کام مسجدوں ہی سے انجام پاتے ہیں: اول: نماز اور اعتکاف جیسی عبادت، دوسرے: اصلاح معاشرہ اور مبادیات دین کی دعوت، جمعہ کا تو اس سلسلہ میں ہے ہی بہت اہم رول؛ لیکن اس کے علاوہ درس قرآن، درس حدیث اور فقہی مسائل کی رہنمائی کے لئے بھی مسجدیں ہی سب سے اہم مراکز ہیں، تیسرے: مسلمانوں کے باہمی ربط کو باقی رکھنے میں بھی مساجد کا اہم کردار ہے، چوتھے: مکاتب کے ذریعہ بنیادی دینی تعلیم کا انتظام، مسلمان کو دین سے جوڑے رکھنے میں ان کاموں کا اہم حصہ ہے۔

مدارس کا وجود یوں تو ہر جگہ اہم ہے؛ لیکن جہاں مسلمان اقلیت میں ہوں، وہاں تو ان کی حیثیت شہ رگ کی ہے، ہندوستان میں مدارس کا قیام ہی اس پس منظر میں ہوا کہ مسلمانوں کو فتنۂ ارتداد سے بچایا جائے اور دین پر ثابت قدم رکھا جائے ،موجودہ حالات میں مدارس بھی دین کے چار بنیادی کاموں کو انجام دے رہے ہیں اور شب و روز ان مقاصد کے لئے افراد کار تیار کرنے میں مشغول ہیں: اول: دین کی اعلیٰ تعلیم، دوسرے: احکام شریعت کی تحقیق؛ تا کہ لوگ اس بات کو سمجھ سکیں کہ اسلام زندگی سے مربوط نظامِ زندگی ہے،اور ہر عہد میں رہنمائی کی صلاحیت رکھتا ہے، تیسرے: اسلام کا دفاع اور اسلام کے خلاف اٹھائے جانے والے فتنوں کا علم اور دلیل کے ذریعہ رَد، چوتھے: دینی تحریکات کی علمی وفکری مدد اور ان کے لئے افرادی وسائل کی فراہمی، مدارس کے نصابِ تعلیم اور نظامِ تربیت میں قدم قدم پر ان امور کا لحاظ رکھا گیا ہے، اور اس میں شبہ نہیں کہ مدارس ان تمام کاموں کو بڑی حد تک خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دے رہے ہیں۔

اس لئے یہ ایک نا قابل انکار حقیقت ہے کہ مساجد اور مدارس مسلمانوں کی دینی زندگی کے لئے بے حد اہم ہیں؛ اگر یہ نہ ہوتے تو ہندوستان اور اس جیسے ممالک میں مسلمانوں کو ایمان پر باقی رکھنا بے حد دشوار ہوتا اور ارتداد و الحاد کا طوفان نئی نسل کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا۔

دین کے یہ دونوں مراکز دینی خدمت گزاروں کے ذریعہ قائم ہیں، یوں تو ملک میں مدارس کی تعداد ہزاروں میں ہے، ہر سال فارغ ہونے والے علماء اور حفاظ بھی بعید نہیں کہ پچاس ہزار تک پہنچتے ہوں؛ لیکن ان کی ایک بہت ہی مختصر تعداد دینی خدمت کی لائن میں آتی ہے، ان ہی کے ذریعہ مساجد و مدارس کا نظام قائم ہے، یہ چیز بھی علماء کے حصہ میں اپنے بزرگوں کی میراث کے طور پر چلی آرہی ہے کہ وہ بہت ہی معمولی معاوضہ پر دینی خدمت انجام دیتے ہیں، یہ اتنا کم ہوتا ہے کہ اسے معاوضہ کہتے ہوئے بھی شرم آتی ہے، جب کہ ان کی خدمت کے اوقات بمقابلہ دوسرے لوگوں کے کافی زیادہ ہوتے ہیں، حد تو یہ ہے کہ بعض دفعہ عصری تعلیمی اداروں میں

انگریزی، حساب اور دیگر عصری مضامین پڑھانے والے ساتھیوں کے مقابلہ ان کی تنخواہ کم رکھی جاتی ہے؛ لیکن پھر بھی وہ حفاظت دین کے جذبہ کے تحت اس پر قناعت کرتے ہیں؛ اگر دین کے یہ خدمت گزار نہ رہیں تو اگلے بیس پچیس سالوں میں مسلمانوں کے لئے اپنی نسلوں کے ایمان کو بچانا مشکل ہو جائے گا۔

مدارس و مساجد کے نظام کو فعال اور خود مختار رکھنے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ ان کا حق الخدمۃ عام مسلمانوں کے تعاون سے ادا ہو، حالانکہ بعض جگہ حکومت چاہتی ہے کہ مساجد کے ائمہ اور مدارس کے اساتذہ کی تنخواہیں وہ ادا کرے، کئی ریاستوں میں اس کے لئے مدارس کے بورڈ بھی بنائے گئے ہیں، کئی ریاستوں میں وقف بورڈ نے ائمہ کی تنخواہوں کی ذمہ داری اپنے سر لے لی ہے، اور افسوس کہ بعض جگہ مساجد و مدارس کے منتظمین اور ائمہ و مدرسین نے اسے قبول بھی کرلیا ہے؛ لیکن درحقیقت یہ ایک میٹھا زہر ہے، آج اس کی مٹھاس اپنی طرف کھینچ رہی ہے؛ لیکن یہ چیز آہستہ آہستہ ان مقاصد کے لئے جان لیوا ثابت ہوگی، جن کے لیے یہ دینی مراکز قائم ہوئے تھے، پھر مساجد میں خطباء تو ہوں گے؛ لیکن ان کے منہ میں حکومت کی زبان ہوگی، مدارس میں علماء تو ہوں گے؛ لیکن ان کو حکومت کے چشم و ابرو کے اشاروں پر چلنا پڑے گا، دینی تعلیم سے آراستہ مصنفین تو ہوں گے؛ لیکن ان سے اسلام کی حمایت کے بجائے اسلامی تعلیمات کو مسخ کرنے کا م لیا جائے گا؛ اس لئے اگر ہمیں ان مراکز کو اپنے اصل مقاصد پر قائم رکھنا ہے تو صحیح طریقہ یہی ہے کہ مسلمان خود ان کی ضروریات پوری کریں۔

اس سلسلہ میں عام مسلمانوں کی بھی کچھ ذمہ داریاں ہیں، حقیقت یہ ہے کہ مدارس کے اساتذہ وعملہ اور مساجد کے ائمہ و مؤذنین پوری قوم کی خدمت کر رہے ہیں؛ اس لئے قوم کی ذمہ داری ہے کہ وہ بہتر اور باعزت طریقے پر ان کی کفالت کریں، اس کفالت کی ایک صورت تو یہ ہے کہ مدارس و مساجد کی انتظامیہ کو تعاون پیش کیا جائے، اور حالات کے پس منظر میں ہنگامی مدد کی جائے، دوسرے: دینی خدمت گزاروں کی انفرادی طور پر کفالت قبول کی جائے؛ اگر ہر شہر میں دس اصحاب خیر مل کر اپنا گروپ بنائیں اور یہ گروپ خدام دین میں سے ایک فرد یا ایک سے زائد افراد کی بنیادی ضروریات، راشن، علاج اور بچوں کی تعلیمی فیس کا آئندہ چھ ماہ کے لیے ذمہ لے لیں اور خاموشی کے ساتھ اپنی اعانت ان تک پہنچا دیں، تو ان پر کچھ زیادہ بوجھ نہیں پڑے گا، اور کتنے ہی خدام دین کی کفالت ہو جائے گی، ہر شہر میں ایسے ہزاروں گروپ بن سکتے ہیں اور بہ سہولت مدارس اور مساجد کے خدمت گزاروں کا مسئلہ حل ہو سکتا ہے، یہ دس افراد کے گروپ کی بات تو بطور سہولت کہی گئی ہے؛ ورنہ ملت میں ایک بڑی تعداد ایسے افراد کی ہے جو تنہا خدمتِ دین میں مشغول کئی خاندان کی کفالت کر سکتے ہیں، اس طبقہ

پر خرچ کرنے میں دوہرا اجر ہے، ایک تو صدقہ کا، دوسرے: بالواسطہ دینی خدمت میں تعاون کا؛ چنانچہ مشہور محدث امام عبداللہ بن مبارکؒ کے بارے میں منقول ہے کہ وہ اپنی اعانتیں علماء پر ہی خرچ کرتے تھے، اور فرماتے تھے کہ مقام نبوت کے بعد علماء سے بڑھ کر کوئی بلند مرتبہ نہیں، (الاتحاف: ۴/ ۴۱۷)

مشہور فقیہ علامہ علاء الدین حصکفیؒ فرماتے ہیں: **التصدق علی العالم الفقیر أفضل و علی الزهاد** (درمختار: ۳/ ۳۰۴) ''محتاج عالم یا عابد وزاہد لوگوں پر صدقہ کرنا افضل ہے''۔

خود قرآن مجید میں اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: صدقہ میں اصل حق ان حاجت مندوں کا ہے، جو اللہ کی راہ میں گھِر گئے ہیں، ملک میں کہیں چل پھر نہیں سکتے، دست سوال نہ پھیلانے کی وجہ سے ناواقف ان کو مالدار سمجھتے ہیں، تم ان کو ان کے چہرہ سے پہچان سکتے ہو، وہ لوگوں سے لپٹ کر نہیں مانگتے اور تم مال میں سے جو کچھ خرچ کروگے، اللہ تعالیٰ اس سے خوب واقف ہیں۔ (البقرہ: ۲۷۳)

اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ جو محتاج اور ضرورت مند حضرات دین کے کام کی وجہ سے کسب معاش میں مستقل طور پر لگنے کے موقف میں نہ ہوں، وہ اعانتوں کے زیادہ مستحق ہیں؛ اسی لئے اکابر مفسرین کا رجحان یہی ہے کہ جس وقت یہ آیت نازل ہوئی، اس وقت اس سے اصحابِ صفہ یعنی صفہ میں مقیم طالبانِ علوم نبوت کی طرف اشارہ تھا؛ (دیکھئے: تفسیر کبیر: ۳/ ۶۳۹ تفسیر قرطبی: ۳/ ۳۴۹) بلکہ خود رسول اللہ کے زمانہ سے یہ طریقہ مروج تھا کہ اہل ثروت صحابہ رضی اللہ عنہم اپنے کھجور اصحابِ صفہ کے لئے پیش کیا کرتے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی طرف سے ان کو اس کی ہدایت ہوتی تھی؛ اس لئے یوں تو تمام محتاج وضرورت مند مسلمانوں کی مدد کرنی چاہئے؛ لیکن اس طبقہ کا خصوصی استحقاق قرآن سے بھی ثابت ہے، حدیث سے بھی، سلف صالحین کے عمل سے بھی، اور یہ زیادہ مکمل طریقے پر انفاق کے مقاصد کو پورا کرتا ہے۔

اگر دشوار حالات میں اس طبقہ کا لحاظ نہیں کیا گیا تو اندیشہ ہے کہ جو مختصر سی تعداد خدمت دین کے میدان میں آتی ہے، وہ بھی آئندہ اس خارزار میں قدم رکھنے سے اجتناب کرنے لگے گی اور امت کو مخلص خدامِ دین کو چراغ لے کر ڈھونڈنا پڑے گا۔

اصلاحی مضامین

کرکٹ کو کھیل ہی رہنے دو جنون نہ بناؤ

کھیل کود کے اسلامی حدود اور حقوق واجبہ سے دوری اور اس کے لئے ضروری اقدامات

ازقلم: مفتی محمد عبدالحمید شاکر قاسمی*

انسانی زندگی محض کھیل تماشہ نہیں بلکہ ایک عظیم امانت اور ذمہ داری ہے جس کا ہر لمحہ اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہ ہے۔ جب انسان اس حقیقت کو بھول جاتا ہے تو اس کی زندگی کا رخ بدل جاتا ہے اور وہ معمولی چیزوں کو اپنی ترجیحات کا مرکز بنالیتا ہے۔ قرآن مجید نے نہایت بلیغ انداز میں اس حقیقت کو بیان فرمایا: أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثًا (المؤمنون: 115) یعنی کیا تم نے یہ سمجھ لیا ہے کہ ہم نے تمہیں بے مقصد پیدا کیا ہے؟ دوسری جگہ مقصدِ حیات ان الفاظ میں بیان فرمایا: وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ (الذاریات: 56) کہ انسان کی تخلیق کا مقصد صرف عبادت ہے۔ لیکن افسوس کہ آج کا انسان خصوصاً نوجوان طبقہ ایسے مشاغل میں مبتلا ہو چکا ہے جو نہ صرف اس کے وقت کو ضائع کرتے ہیں بلکہ اس کے دین و دنیا دونوں کے لیے نقصان دہ ہیں، اور انہی میں ایک بڑا فتنہ کرکٹ کا جنون ہے۔ دنیا کی حقیقت کو سمجھنا ہر انسان کے لیے ضروری ہے کیونکہ جب تک حقیقت واضح نہ ہو ترجیحات درست نہیں ہوتیں۔

قرآن مجید اس دھوکہ سے پردہ اُٹھاتے ہوئے فرماتا ہے: وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا لَعِبٌ وَلَهْوٌ (الأنعام: 32) یعنی دنیا کی زندگی محض کھیل اور تماشا ہے۔ یہاں "لہو" اس چیز کو کہا گیا ہے جو انسان کو اصل مقصد سے غافل کردے۔ مفسرین نے لکھا کہ ہر وہ مشغلہ جو اللہ کی یاد سے دور کرے وہ لہو ہے۔ آج کرکٹ اسی تعریف میں داخل ہوتا دکھائی دیتا ہے کیونکہ یہ انسان کو نماز، ذکر اور ذمہ داریوں سے غافل کردیتا ہے اور آہستہ آہستہ اس کے دل پر قبضہ کرلیتا ہے۔ یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہیے کہ اسلام فطرت کے خلاف نہیں بلکہ اعتدال کا دین ہے، اس نے کھیل کود کو مکمل طور پر منع نہیں کیا بلکہ اس کے لیے حدود مقرر کی ہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں آتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے ساتھ دوڑ لگائی (ابوداؤد: 2578) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جسمانی سرگرمی جائز ہے، مگر فقہاء نے یہ قاعدہ بیان کیا کہ اگر یہی کھیل اللہ کی اطاعت سے غافل کردے تو وہ مذموم ہو

* جامعہ عربیہ توپران ضلع میدک تلنگانا

جاتا ہے۔اس لیے اصل مسئلہ کھیل نہیں بلکہ اس کا حد سے بڑھ جانا ہے۔ابتداء میں کرکٹ ایک کھیل تھا لیکن اب یہ ایک جنون بن چکا ہے۔جب کوئی چیز انسان کے دل و دماغ پر اس قدر غالب آجائے کہ وہ اس کے بغیر بے چین ہوجائے تو وہ محض مشغلہ نہیں رہتی بلکہ ایک نفسیاتی غلامی بن جاتی ہے۔آج کرکٹ کا حال یہی ہے کہ انسان اپنے اوقات، اپنی ترجیحات اور اپنی ذمہ داریوں کو اس کے تابع کر دیتا ہے۔ہر دور میں فتنوں کے پھیلنے کے اسباب ہوتے ہیں اور آج کے دور میں کرکٹ کے فروغ کا سب سے بڑا ذریعہ میڈیا ہے۔میڈیا نے اسے اس انداز میں پیش کیا ہے کہ گویا یہ زندگی کا لازمی حصہ ہے۔قرآن مجید فرماتا ہے: **وَمِنَ النَّاسِ مَن يَشْتَرِي لَهْوَ الْحَدِيثِ** (لقمان:6) مفسرین نے "**لَهْوَ الْحَدِيثِ**" کی تفسیر ہر اس چیز سے کی ہے جو انسان کو اللہ کے راستے سے ہٹا دے، اور آج کے میچز، کمنٹری اور تجزیے اسی کا مصداق ہیں۔کرکٹ کے ساتھ جڑے اشتہارات ایک الگ فتنہ ہیں جو آہستہ آہستہ انسان کے دل کو متاثر کرتے ہیں۔ان میں بے پردگی، موسیقی اور غیر اسلامی طرزِ زندگی کو خوبصورت بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔قرآن مجید فرماتا ہے: **إِنَّ الَّذِينَ يُحِبُّونَ أَن تَشِيعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِينَ آمَنُوا** (النور:19) یعنی جو لوگ چاہتے ہیں کہ بے حیائی پھیلے ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔اس لیے صرف دیکھنا بھی خطرے سے خالی نہیں۔انسان کی سب سے قیمتی چیز اس کا وقت ہے، اور یہی سب سے زیادہ ضائع ہو رہا ہے۔نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: **لا تزول قدما عبد يوم القيامة حتى يسأل عن عمره فيما أفناه** (ترمذی:2416) یعنی قیامت کے دن انسان سے اس کی عمر کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ایک میچ کے کئی گھنٹے اور پورے سلسلے کے کئی دن صرف ہوجاتے ہیں، جو کہ ایک عظیم خسارہ ہے۔

حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ انسان دنوں کا مجموعہ ہے، ہر دن کے گزرنے سے اس کا ایک حصہ ختم ہوجاتا ہے۔تعلیم کا نقصان ایک ایسا المیہ ہے جو خاموشی سے پوری نسل کو متاثر کر رہا ہے۔آج کا طالب علم کھلاڑیوں کے نام، رنز اور ریکارڈ تو یاد رکھتا ہے لیکن اپنے اسباق اور قرآن سے دور ہوتا جا رہا ہے۔یہ وہ نقصان ہے جو وقتی طور پر محسوس نہیں ہوتا مگر مستقبل کو تباہ کر دیتا ہے۔والدین کے حقوق کو اسلام نے بہت بلند مقام دیا ہے، مگر افسوس کہ آج اس تعلق میں بھی کمزوری آرہی ہے۔قرآن کہتا ہے: **وَلَا تَقُل لَّهُمَا أُفٍّ** (الاسراء:23) جب "اُف" کہنا بھی منع ہے تو ان کی بات کو نظر انداز کرنا کس قدر بڑی نافرمانی ہے۔کرکٹ بینی کے دوران والدین کی آواز کو نظر انداز کرنا ایک عام بات بن چکی ہے۔کھلاڑیوں کی اندھی تقلید ایک فکری انحطاط کی علامت ہے۔نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: **من تشبه بقوم فهو منهم** (ابوداود:4031) آج نوجوان بچے کھلاڑیوں کے لباس، انداز اور طرزِ زندگی کو اپناتے ہیں، جس سے ان کی اپنی شناخت متاثر ہوتی ہے اور دلوں میں غلط محبت

پیدا ہوتی ہے۔ کرکٹ کے دوران جذباتی ردعمل بھی ایک بڑا مسئلہ ہے۔ چیخنا، گالیاں دینا، لڑنا اور تعصب اختیار کرنا عام ہو چکا ہے، حالانکہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: **سباب المسلم فسوق** (بخاری:48) یعنی مسلمان کو گالی دینا فسق ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ رویہ ایمان کے خلاف ہے۔ صحت کے حوالے سے بھی یہ جنون نقصان دہ ہے۔ رات بھر جاگنا، مسلسل اسکرین دیکھنا اور ذہنی دباؤ صحت کو متاثر کرتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: **إن لنفسك عليك حقاً** (بخاری:5199) یعنی تمہارے جسم کا بھی تم پر حق ہے۔ جب کوئی چیز انسان کے دل پر حاوی ہو جائے تو وہ اس کا غلام بن جاتا ہے۔ قرآن مجید فرماتا ہے: **أَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَٰهَهُ هَوَاهُ** (الجاثیہ:23) یعنی جس نے اپنی خواہش کو اپنا معبود بنا لیا۔ کرکٹ کا جنون اسی کیفیت کو ظاہر کرتا ہے جہاں انسان اپنی خواہشات کا تابع ہو جاتا ہے۔ اسلام انسان کو بامقصد زندگی سکھاتا ہے اور فضولیات سے دور رہنے کی تلقین کرتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: **من حسن إسلام المرء تركه ما لا يعنيه** (ترمذی:2317) یعنی انسان کے اسلام کی خوبی یہ ہے کہ وہ غیر ضروری چیزوں کو چھوڑ دے۔ سلف صالحین نے وقت کی قدر کو بہت اہمیت دی ہے۔

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ وہ ایسے شخص کو ناپسند کرتے ہیں جو فارغ ہو۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ وقت تلوار ہے، اور ابن القیمؒ فرماتے ہیں کہ وقت کا ضیاع موت سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ یہ اقوال ہمیں جھنجھوڑتے ہیں کہ ہم اپنی زندگی کو کس میں لگا رہے ہیں۔ یہاں پر ایک اور امر کو واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ کھیل دیکھنا اپنی اصل میں ایک مباح اور فطری امر ہے، اور جب کوئی ٹیم اپنے وطن یا صوبے کی نمائندگی کرتے ہوئے میدان میں اترتی ہے تو ایک فطری خوشی اور وابستگی کا پیدا ہونا بھی قابلِ فہم ہے۔ انسان اپنے علاقے، قوم یا ملک کے نمائندوں کی کامیابی پر خوش ہوتا ہے، اور یہ خوشی ایک حد تک جائز اور انسانی جذبہ ہے۔ اگر کوئی کھلاڑی اپنی محنت، نظم اور صلاحیت کے ذریعے ملک یا صوبے کا نام روشن کر رہا ہے تو اس کی قدر اپنی جگہ ہے، اور اس کی کامیابی پر دل کا خوش ہونا بھی ایک فطری کیفیت ہے جس میں شرعاً کوئی قباحت نہیں۔ لیکن مسئلہ وہاں سے شروع ہوتا ہے جہاں یہ فطری خوشی ایک غیر متوازن وابستگی اور حد سے بڑھتے ہوئے انہماک میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ جب انسان کھیل کو دیکھنے والا نہیں رہتا بلکہ اس میں ڈوب جاتا ہے، جب اس کا دل و دماغ اسی میں اس قدر مشغول ہو جائے کہ وہ اپنے اصل مقاصد، ذمہ داریوں اور فرائض کو بھول بیٹھے تو یہی جائز چیز ناپسندیدہ بلکہ بعض اوقات گناہ کا سبب بن جاتی ہے۔ یہ کیفیت دراصل ایک طرح کی غفلت اور بے فکری ہے جس میں انسان اپنی حقیقت سے دور ہو جاتا ہے۔ آج عام طور پر یہ دیکھا جاتا ہے کہ لوگ میچ شروع ہونے سے کئی گھنٹے پہلے ہی اپنے تمام کام چھوڑ کر اس کے لیے فارغ ہو جاتے ہیں، کاروبار کو مؤخر کر دیتے ہیں، ملازمت میں کوتاہی برتتے ہیں،

بعض اوقات ڈیوٹی کے اوقات میں بھی اسکور دیکھتے رہتے ہیں یا میچ کی مصروفیت میں اپنے فرائض سے غفلت برتتے ہیں۔ یہ طرزِ عمل نہ صرف شرعاً ناپسندیدہ ہے بلکہ دیانت اور امانت کے خلاف بھی ہے، کیونکہ ملازمت اور کاروبار دونوں ایک ذمہ داری ہیں جن میں خیانت کی اجازت نہیں۔ اسی طرح سفر کے دوران بھی کرکٹ کے اسکور میں اس قدر انہماک ہوجانا کہ انسان اپنی جان اور دوسروں کی جان کو خطرے میں ڈالتا ہے، ڈرائیونگ کے دوران اسکور دیکھنا یا میچ میں ذہنی طور پر اس قدر کھوجانا کہ توجہ سڑک سے ہٹ جائے، یہ صرف ایک غفلت نہیں بلکہ ایک ممکنہ حادثے کا سبب ہے، اور شریعت میں اپنی جان کو خطرے میں ڈالنا جائز نہیں۔ سب سے زیادہ تشویشناک پہلو عبادات کے ساتھ اس وابستگی کا ٹکراؤ ہے۔ بعض لوگ کرکٹ کے لیے نماز کو جلدی جلدی ادا کرتے ہیں، خشوع وخضوع کو ختم کر دیتے ہیں، یا نماز کے دوران ہی اسکور دیکھنے کی فکر میں مبتلا رہتے ہیں۔ یہ رویہ اس بات کی علامت ہے کہ دل میں ترجیحات بدل چکی ہیں۔ نماز جو کہ بندے اور اللہ کے درمیان سب سے اہم تعلق ہے، اگر وہ بھی کھیل کے تابع ہوجائے تو یہ ایمان کے لیے خطرے کی علامت ہے۔

قرآن مجید میں فرمایا گیا: فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّينَ الَّذِينَ هُمْ عَن صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ (الماعون:4-5) یعنی ان نمازیوں کے لیے ہلاکت ہے جو اپنی نماز سے غافل ہیں درحقیقت اعتدال ہی اصل مطلوب ہے۔ کھلاڑی اپنی ذمہ داری ادا کر رہے ہیں، وہ اپنی ڈیوٹی پر ہیں، ان کی محنت اپنی جگہ، ان کی کامیابی اپنی جگہ، مگر دیکھنے والے کے لیے بھی ایک حد ہونی چاہیے۔ اس حد سے تجاوز کرنا انسان کو اس مقام تک لے جاتا ہے جہاں وہ اپنی اصل ذمہ داریوں سے غافل ہوجاتا ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ انسان اپنے آپ کو قابو میں رکھے، اپنے مشاغل کو اپنی ذمہ داریوں کے تابع رکھے، نہ کہ ذمہ داریوں کو مشاغل کے تابع کرے۔ کھیل کو کھیل کی حد تک رکھا جائے، اس سے لطف لیا جائے مگر اس میں اس حد تک نہ ڈوبا جائے کہ انسان اپنی عبادت، اپنے والدین، اپنے کام اور اپنے مقصدِ زندگی کو بھول جائے۔ یہی اعتدال شریعت کا تقاضا ہے اور یہی ایک مومن کی پہچان ہے۔ اصلاح کا راستہ یہی ہے کہ انسان شعور حاصل کرے، اپنے وقت کی حفاظت کرے، نماز کو مقدم رکھے، غیر ضروری مشاغل کو محدود کرے اور اپنی زندگی کو دین کے مطابق ڈھالے۔ خلاصہ یہ ہے کہ کرکٹ بذاتِ خود حرام نہیں لیکن جب یہ عبادت میں رکاوٹ بنے، وقت کو ضائع کرے، اخلاق کو بگاڑے اور انسان کو اپنی اصل ذمہ داریوں سے دور کر دے تو یہ ایک خطرناک فتنہ بن جاتا ہے۔ ایک مسلمان کی کامیابی اس میں نہیں کہ وہ کھیلوں کے نتائج یاد رکھے بلکہ اس میں ہے کہ وہ اپنے اعمال کو درست کرے اور اپنی آخرت کو سنوارے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں لایعنی مشاغل سے بچنے، وقت کی قدر کرنے اور اپنی زندگی کو دین کے مطابق گزارنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

اصلاحی مضامین

کلمہ کے الفاظ میں ’’عبد القادر شیأ للہ‘‘ کا اضافہ

چند ضروری وضاحتیں

تحریر کردہ: مولانا محمد انصار اللہ قاسمی*

ماہ جون ۲۰۲۵ء میں شہر حیدرآباد کی ایک معروف شخصیت کے عرس کے موقع پر جلوس میں عقیدت مند ’’لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ‘‘ کے بجائے ’’لا الہ الا اللہ عبد القادر شیأ للہ‘‘ کا ورد کرنے لگے، اس پر اعتراض کیا گیا، اس اعتراض کے جواب میں معروف شخصیت کے جانشین صاحب نے اپنا ویڈیو ریکارڈ کروایا، اور کلمہ کے الفاظ میں ’’عبد القادر شیأ للہ‘‘ کی شمولیت کو درست ٹھہرایا، اس سلسلہ میں انھوں نے تاریخ جامعہ نظامیہ جلد سوم (مؤلف مولانا فصیح الدین نظامی) کے حوالہ سے ایک فتویٰ بھی پیش کیا، اپنے ویڈیو میں انھوں نے کہا:

’’امسال شہزادہ حضور غوث الاعظم [مولانا کاظم پاشاہؒ] کا پانچواں عرس مبارک ۲۴ ذی الحجہ ۱۴۴۶ھ/ مطابق ۲۱ جون ۲۰۲۵ء بروز ہفتہ خانقاہ قادریہ موسویہ میں انعقاد پذیر ہوگا، چند دن قبل جلوس کاظمی جو شہزادہ غوث الاعظم کے عرس کے موقع پر نکالا جاتا ہے، اس کے حوالہ سے سوشیل میڈیا پر کچھ نادان لوگوں نے ایک پروپیگنڈہ عام کیا اور کچھ غلط باتیں اس فقیر قادری کی طرف منسوب کی، اولاً تو میں آپ تمام حضرات سے عرض کروں کہ جو الیگیشن (Allegation) لگایا گیا اور جو الزام لگایا گیا وہ بالکل بے بنیاد ہے، **لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ** یہ شہادتین کے طور پر کہا جاتا ہے، یہ ہمارے ایمان کا جز ہے، اللہ رب تبارک وتعالیٰ کی یکتائی اور اس کی توحید کا اقرار کرنا اور یہ گواہی دینا کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور ہمارے آقا و مولیٰ علیہ الصلوۃ والسلام محمد رسول اللہ اس کے رسول ہیں، اب خانقاہ موسویہ قادریہ چوں کہ حضور پیران پیر سیدنا غوث اعظم دستگیر کی اولاد و امجاد میں ہندوستان کی سرزمین پر صحیح النسب خاندان شمار تسلیم کیا جاتا ہے، ہمارے سلسلہ کا یہ طریقہ کار ہے پچھلے کئی صدیوں سے **لا الہ الا اللہ** یعنی وہ کلمہ جس کے ذریعہ پاکی حاصل کی جاتی ہے، قلب کی، زبان کی، روح

* آرگنائزر مجلس تحفظ ختم نبوت، تلنگانا و آندھرا

کی،سوچ کی اورفکر کی ،اس کے بعد وظیفۃً **عبد القادر شیأ للہ** کہا جا تا ہے، میں زیادہ تفصیل میں گئے بغیر ایک شک کا ،ایک شبہ کا ، ایک غلط فہمی کا ازالہ کرنا چاہتا ہوں ، میں دیگر علماء اور مفتیان نے کیا کہا ،اس کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا ،فی الحال میرے ہاتھ میں یہ کتاب ہے، تاریخ جامعہ نظامیہ،حضرت مولانا فصیح الدین نظامی صاحب نے اس کو مرتب کیا ہے،اس کی جلد سوم کے صفحہ نمبر ۱۱۵ پر مستفتی نے استفتاء کیا اور استفتاء جس سے کیا گیا وہ کوئی معمولی شخصیت نہیں بل کہ ہندوستان کے اکابر علماء میں جن کا شمار کیا جاتا ہے اور جامعہ نظامیہ کے اکابر میں جن کا شمار ہے، جتنے شیوخ حالیہ دنوں میں گذرے ہیں ان سب نے ان سے شرف تلمذ حاصل کیا ہے،ان سے کسی نے استفتاء کیا، جو جامعہ نظامیہ کے صدر مفتی گذرے ہیں، پوچھا گیا ’’**لا الہ الا اللّٰہ عبد القادر شیأ للہ** ، یہ ملا کر پڑھنا کیسا ہے؟ آپ فرماتے ہیں:

’’**لا الہ الا اللّٰہ**، **عبد القادر شیأ للہ**، یہ دو جملہ ہیں، ہر ایک اپنے اپنے صحیح معنی پر دلالت کرتا ہے، **لا الہ الا اللّٰہ** توحید پر اور **عبد القادر شیأ للہ**،توسل واستغاثہ پر، اس لئے یہ کہنا بھی نہ کفر ہے نہ حرام ،حضرت فرماتے ہیں یہ کہنا نہ کفر ہے نہ حرام ،اس کے بعد فرماتے ہیں مگر اس ترکیب سے چوں کہ وہم پیدا ہوتا ہے، **عبد القادر شیأ للہ** بجائے **محمد رسول اللّٰہ** کے کہا گیا ہے، اس لئے ایسے الفاظ سے احتیاط کرنا بہتر ہے،حضرت فرماتے ہیں احتیاط کرنا بہتر ہے،ساتھ میں یہ بھی فرماتے ہیں اگر کوئی شخص یہ کہے، **لا الہ الا اللّٰہ عبد القادر شیأ للہ** یا پھر **لا الہ الا اللّٰہ علی ولی اللّٰہ** تو یہ نہ کفر ہوگا ، نہ حرام ہوگا ، یہ جامعہ نظامیہ کا فتویٰ ہے، جو میں نے آپ کو پڑھ کر سنایا ہے‘‘.....

(مورخہ ۲۱/ جون ۲۰۲۵ء کو جناب سید علی قادری صاحب کے فیس بک پیج پر جاری کردہ ویڈیو)

محترم موصوف کی اس وضاحت کے سلسلہ میں چند معروضات پیش خدمت ہے ہیں:

۱) سب سے پہلے اہم اور بنیادی بات یہ ہے کہ دین اسلام عقیدۂ توحید کے معاملہ میں انتہائی حسّاس ہے، اس کے لئے کچھ نرمی اور معمولی چھوٹ بھی اسلامی تعلیمات میں گوارہ نہیں کی گئی، اس لئے نہ صرف یہ کہ کھلے اور واضح شرک سے منع کیا گیا، بل کہ ’’شبہ شرک‘‘ (جس سے شرک کا شبہ پیدا ہوتا ہے ہو) سے دور رہنے کی تعلیم دی گئی، چنانچہ مکروہ اوقات میں نماز پڑھنے کی ممانعت کی وجہ یہی ’’شبہ شرک‘‘ ہے، کہ آفتاب کے طلوع ، زوال اور غروب کے وقت مسلمان کو نماز پڑھتا دیکھ کر کہیں یہ غلط فہمی نہ ہو کہ مسلمان سورج کی عبادت کرتے ہیں۔

اس لئے صرفِ نظر اس بات سے کہ ''**عبد القادر شیأ للہ**'' کے الفاظ بطور وظیفہ کے پڑھے گئے ہیں، یا اس میں توسل واستمداد ہے، ان کلمات پر اصرار کرنا اور اس کو رواج دینا درست نہیں ہے، کیوں کہ اس سے غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کہ یہ شرک نہ سہی شبہ شرک تو ہے اور یہ وہم بھی ہوسکتا ہے کہ شاید کلمہ کے الفاظ ہی بدل دیے گئے ہیں۔

۲) جو چیز جائز اور صحیح ہو، ضروری نہیں کہ وہ قابل عمل بھی ہو، بعض مرتبہ کوئی عمل فی نفسہ جائز اور صحیح ہوتا ہے، لیکن عام لوگوں کے علم وفہم کے پیش نظر اس عمل کو ترک کردینا بہتر سمجھا جاتا ہے، تاکہ عام لوگوں کے عقیدہ میں بگاڑ وفساد نہ آئے اس سلسلہ میں ایک دو مثالیں ملاحظہ ہوں:

الف: ایک مرتبہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ام المومنین سیّدہ حضرت عائشہؓ سے فرمایا:

''اے عائشہ! اگر تیری قوم نئی نئی مسلمان نہ ہوئی ہوتی تو میں (حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اصل تعمیر کے مطابق) کعبۃ اللہ کے دو دروازے بنا دیتا ایک دروازے سے لوگ داخل ہوتے اور دوسرے سے نکلتے'' (صحیح بخاری حدیث:126)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کعبۃ اللہ کی تعمیر کے سلسلہ میں نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے صحیح منشاء کو اس لئے ترک فرمادیا کہ لوگ بدگمانی میں مبتلا نہ ہوں۔

ب: خلیفہ چہارم سیدنا حضرت علیؓ فرماتے ہیں:

''تم لوگوں سے وہ باتیں بیان کرو جن کو وہ سمجھ سکتے ہیں (عوام کے سامنے ان کی سمجھ سے بالاتر باتیں بیان کرکے) کیا تم یہ چاہتے ہو کہ اللہ اور اس کے رسول کی باتیں جھٹلا دی جائیں'' (صحیح بخاری، حدیث نمبر:127)

عوام میں بہت کم ہی لوگ عقائد کے بارے میں باشعور ہوتے ہیں، انھیں اس کا علم وفہم ہی نہیں ہوتا کہ وہ ''**عبد القادر شیأ للہ**'' کے الفاظ میں حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؒ کو بالذات مقصود بنا کر وہ ان کو مدد کے لئے پکار رہے، یا صرف بطور وسیلہ کے ان کو آواز دے رہے ہیں، جیسے عام طور پر کوئی بندہ اپنے ساتھی سے کہتا ہے ''اللہ کے واسطے میری کچھ مدد کردو''، اس لئے ان کلمات کو عمومی رواج دینا توحید کے معاملہ میں عوام کے لئے فتنہ و آزمائش کا ذریعہ بن سکتا ہے۔

۳) واضح رہے کہ توسل واستمداد کو بزرگوں اور اہل علم نے مطلق جائز قرار نہیں دیا، اس کی مختلف صورتیں بیان کی گئیں، ان میں بعض صورتیں تو صریح کفر وشرک کی ہیں، بعض ناجائز اور حرام ہیں اور بعض جائز ہیں، مثلاً:

الف: اگر کسی ولی یا بزرگ کو مستقل بالذات اور فاعلِ حقیقی مان کر انہیں پکارا جارہا ہے اور ان سے مدد

مانگی جارہی ہے تو یہ سراسر کفر و شرک ہے۔

ب : اگر ولی یا بزرگ کو یہ سمجھ کر پکارا جارہا ہے اور مدد مانگی جارہی کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کچھ اختیارات ان کے حوالہ کردیئے ہیں اور وہ متصرف فی الامور ہیں، تو ایسا کرنا بھی شرک ہے۔

ج: جس بزرگ اور ولی کا وسیلہ لیا جارہا ہے، ان کے بارے میں دعاء کرنے والا یہ جانتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے محبوب بندوں میں سے ہیں اور خود یہ شخص بھی اس ولی اور بزرگ سے عقیدت ومحبت رکھتا ہے، اب وہ اپنی اسی عقیدت ومحبت کا حوالہ دے کر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں یہ عرض کرتا ہے:

''اے اللہ میرا عمل اس قابل نہیں کہ آپ کی بارگاہ میں پیش کیا جاسکے، البتہ میں آپ کے محبوب بندے کے چاہنے والوں میں سے ہوں، پس آپ اپنے محبوب بندوں سے تعلق کی لاج رکھتے ہوئے میری یہ حاجت پوری فرمادیئے''۔

توسل کی یہ صورت جائز ہے، بزرگانِ دین کی دعاؤں میں اس کا معمول رہا ہے، جیسا کہ حضرت شیخ سعدیؒ اپنے ایک شعر میں فرماتے ہیں:

''خدایا بحق بنی فاطمہ   کہ برقولِ ایمان کنی خاتمہ''

توسل کی اس صورت میں صرف یہ خیال ہو کہ اللہ تعالیٰ کے محبوب ومقبول بندوں کے طفیل جو دعاء مانگی جاتی ہے اس کی قبولیت کی امید زیادہ ہوتی ہے، یہ عقیدہ ہرگز نہ ہو کہ دعاء کی قبولیت کے لئے وسیلہ ضروری ہے اور وسیلہ لینے کے بعد اللہ تعالیٰ پر دعاء کا قبول کرنا لازم ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا عام مسلمانوں کو — جنہیں عقائد کا صحیح اور پختہ شعور نہیں ہوتا — **''عبد القادر شیأ للہ''** کہتے وقت اللہ تعالیٰ کی یکتائی، اس کی بڑائی اور کبریائی کی ان نزاکتوں کا احساس وادراک ہوتا ہے، عام مشاہدہ تو یہ کہ وہ ''یا اللہ مدد''، اتنا زیادہ نہیں پکارتے جتنا کہ ''المدد یا غوث'' پکارتے ہیں، پیشہ ور واعظین اور جاہل مقررین نے تو اور بھی عوام کے مزاج اور ان کے ذہن ودماغ کو بگاڑ دیا، حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے متعلق ایسی واہیات قسم کی من گھڑت کرامات بیان کی کہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی بزرگی سے زیادہ خدائی ثابت کررہے ہیں، اس سلسلہ میں خود راقم سطور کے ذاتی تجربہ کا ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

راقم سطور کے والد گرامی شہر کے ایک معروف ہاسپٹل میں بہ سلسلۂ علاج ایک ہفتہ شریک تھے، والد صاحب کے کمرہ ہی میں ایک معمّر خاتون بھی بستر مرض پر تھیں، بہت زیادہ بیمار تھیں، بیماری کی شدت اور تکلیف

کی وجہ سے بعض مرتبہ ان کے کراہنے کی آواز بہت بڑھ جاتی تھی، اس دوران وہ صرف یہ کلمات کہتی تھیں ’’یاغوث‘‘ یاغوث‘‘’’یابندہ نواز، یابندہ نواز‘‘ تکلیف کی شدت میں اللہ تعالیٰ کی اس بندی کی زبان سے’’یااللہ، یااللہ‘‘ کے الفاظ سننے کو نہیں ملے، یہاں تک کہ چند دن میں اس معمّر خاتون کا انتقال ہوگیا، انتقال کی خبر سن کر بہت ہی رنج وافسوس ہوا، اور دل سے دعاء نکلی اللہ تعالیٰ اس خاتون کی مغفرت فرمائے، پھر یہ احساس بھی ہوا کہ قصور اس معمر خاتون کا نہیں، قصور اُن واعظین اور مقررین کا ہے جنہوں نے توسل واستمداد کے عنوان پر اولیاء اللہ و بزرگان دین کی فضیلت وعظمت کو اتنا زیادہ بڑھا چڑھا کر اور ایسے انداز واسلوب میں بیان کیا کہ عام مسلمان اولیاء اللہ ہی کو سب کچھ سمجھنے لگے، وہی ان کے لئے حقیقی معنوں میں’’مشکل کشا اور کارساز‘‘ ہوگئے، اس لئے ذہن ودماغ میں جو باتیں مضبوطی کے ساتھ بٹھادی جاتی ہے، انتہائی پریشانی اور مصیبت کے وقت زبان سے ان باتوں کا اظہار ہوجاتا ہے۔

۴) اس لئے جن علماء دین ومفتیان شرعِ متین نے توسل اور استمداد کو صحیح کہا ہے، وہ صرف جواز کی حد تک ہے، ان کا منشاء ہرگز یہ نہیں تھا کہ توسل واستمداد دعاء کی قبولیت کے لئے شرط ہے، یا اس کو مستقل معمول بنالیا جائے، چنانچہ اپنے وضاحتی بیان کے دوران فاضل موصوف نے’’**لا الہ الا اللہ عبد القادر شیأً للہ**‘‘ کے جواز میں جس فتویٰ کے حوالہ پیش کیا ہے اس میں خود یہ صراحت ہے کہ:

> ’’مگر اس ترکیب سے چونکہ یہ وہم پیدا ہوتا ہے کہ’’**عبد القادر شیأً للہ**‘‘ بجائے **محمد رسول اللہ**‘‘ کے کہا گیا ہے، اس لئے ایسے الفاظ منہ سے نکالنے میں احتیاط کرنا بہتر ہے....‘‘

فاضل موصوف نے’’تاریخ جامعہ نظامیہ جلد سوم‘‘ کے حوالہ سے تو صرف یہیں تک کی عبارت پیش کی ہے، لیکن اصل کتاب میں حضرت مولانا مفتی رکن الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ (مفتی اول دار الافتاء مدرسہ نظامیہ حیدرآباد دکن) نے’’تنبیہ‘‘ کے عنوان سے اپنے اس فتویٰ میں فرمایا ہے:

> ’’توسل میں کمالِ ادب کا لحاظ رہے، اور ہرگز ایسے الفاظ کا استعمال نہ کریں جن سے کفر وشرک کا وہم ہو، مثلاً یہ کہنا کہ یا عبد القادر مجھے اولاد دو، یا خواجہ مجھے نوکری دو، اگرچیکہ ایسا کہنا کفر نہیں اور نہ حرام ہے ..تاہم ایسا طلب کرنا آدابِ توحید کے خلاف ہے، اور خصوصاً عوام النّاس کے لئے ایسے طریقہ سے باز رہنا نہایت اہم اور ضروری ہے...‘‘

(حوالہ، فتاویٰ جامعہ نظامیہ، ص:۷۴۴ طبع سوم مارچ ۲۰۱۶ء مطابق ۱۴۳۷ھ)

پس سوال یہاں توسل کے جواز وعدم جواز کا نہیں ہے، اصل اور بنیادی مسئلہ عوام الناس کے عقیدۂ توحید کی صحت وسلامتی اور نہ صرف شرک بلکہ اس کے شبہ اور واہمہ سے بھی مکمل برأت اور بیزارگی کا ہے، تب ہی تو حضرت مفتی صاحب علیہ الرحمۃ باوجود کفر اور حرام نہ ہونے کے یہ فرمارہے ہیں: ''**خصوصاً عوام الناس کو ایسے طریقہ سے باز رہنا نہایت اہم اور ضروری ہے....۔**''

۵) اہل سنت والجماعت کے مقابلہ میں شیعہ فرقہ کی اپنی الگ شناخت و پہچان ہے، ان لوگوں نے عقائد وعبادات اور دیگر تعلیمات کے ساتھ کلمہ میں بھی اپنی الگ شناخت و پہچان باقی رکھی ہے، چنانچہ وہ کلمہ طیبہ میں **لاالٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ** کے بعد **علی ولی اللہ و خلیفۃٌ بلافصل**،، کے الفاظ کا اضافہ کرتے ہیں۔ ''ما أنا علیہ و اصحابی'' کے مصداق اہل سنت والجماعت سے الگ تھلگ ہونے والے فرقوں کے گمراہ ہونے کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں نے ایمانیات میں یا تو کوئی چیز بڑھادی یا کوئی چیز گھٹادی، کلمہ طیبہ کے الفاظ ایمانیات میں سے ہیں، اس لئے بزعم خود اپنی الگ شناخت و پہچان کے لئے ''**عبد القادر شیأً للہ**'' کے ذریعہ کلمہ کے الفاظ میں اضافہ نہیں کیا جاسکتا، اگرچہ کہ وہ بطور وظیفہ ہی کیوں نہ ہو، اس لئے کہ یہ ایمانیات کا مسئلہ ہے، مفتیان کرام نے ''**علی ولی اللہ**'' کے معنی کو نہ صرف درست قرار دیا، بل کہ اس کے ماننے کو ہر مسلمان کے ایمان کا حصہ قرار دیا، کیوں کہ خلیفہ چہارم سیدنا حضرت علیؓ اور تمام صحابہ کرامؓ کو ولایت سے بھی بلند درجہ ''شرف صحابیت'' حاصل ہے، لیکن معنی کے درست ہونے کے باوجود مفتیان کرام نے کلمہ کے الفاظ میں اس جملہ کے اضافہ کو ناجائز بتایا، پس جب حضرت علیؓ جیسے جلیل القدر صحابی کا نام کلمہ میں شامل نہیں کیا جاسکتا تو حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا نام کیسے شامل کیا جاسکتا ہے، اس لئے حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ نے واضح طور پر اس کے کفر وشرک ہونے کا فتویٰ دیا، حضرت قاضی صاحبؒ فرماتے ہیں:

> ....''اور یہ جو جاہل لوگ کہتے ہیں یا ''**شیخ عبد القادر جیلانی شیأً للہ**'' یا **خواجہ شمس الدین پانی پتی شیأً للہ**'' جائز نہیں، بلکہ شرک وکفر ہے اور اگر یوں کہے کہ ''یا الٰہی! بطفیل خواجہ شمس الدین پانی پتیؒ میرا یہ کام کردے تو کوئی مضائقہ نہیں..''
>
> (حوالہ: اختلاف امت اور صراط مستقیم ص ۶۵)

بہرحال! توسل واستمداد کے بارے میں متعلق علمی وفقہی بحثوں سے قطع نظر عقیدۂ توحید میں پختگی، شرک اور شبہ شرک سے مکمل برأت و بیزارگی اور بادی النظر میں عامۃ المسلمین کے عقائد کی درستگی اور ان کے ایمان کی سلامتی کے لئے کلمہ کے الفاظ میں **عبد القادر شیأً للہ** کا اضافہ ناقابل قبول ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو دین کا صحیح علم اور صحیح فہم عطا فرمائے۔ آمین

تذکرۂ اسلاف

بانئِ دارالعلوم دیوبند حضرت حاجی سید محمد عابد حسینؒ

حیات اور کارنامے

از: مفتی رفیع الدین حنیف قاسمی*

سرزمین ہند ابتداء ہی سے نہایت زرخیز رہی ہے۔ یہاں سے اللہ عزوجل نے دین کی خدمت کا وہ کام لیا ہے جس پر سارا عالم رشک کناں ہے۔ انہی عظیم اور عبقری شخصیات میں حضرت سید محمد حاجی عابد حسینؒ کی شخصیت باکمال ہے، جن کے ذہن میں اللہ عزوجل نے دارالعلوم دیوبند کے اولین خاکہ کی شکل ڈالی، جس دارالعلوم کا فیض اب تک جاری و ساری ہے۔ یہ شخصیت بھی اپنے عظیم کارناموں، زندہ و جاوید روحانی سرگرمیوں اور دارالعلوم دیوبند کے ابتدائی انتظامی وانصرامی امور کے ذمہ دار کی حیثیت سے جانی جاتی ہے۔

نام ونسب اور ولادت

حضرت حاجی محمد عابد حسین نوراللہ مرقدہ دیوبند کے مشہور خانوادۂ سادات کے روشن چشم و چراغ تھے۔

آپ کی ولادت باسعادت ۱۲۵۰ھ بمطابق ۱۸۳۴ء میں ہوئی۔ جد اعلیٰ شاہ بندگی محمد ابراہیمؒ تھے، مزار مبارک محلہ سرائے پیرزادگان میں آج بھی مرجع خلائق ہے۔ نسب حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے واسطے سے بواسطہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سرور دوعالم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جاملتا ہے۔

تعلیم وتربیت اور سلوک

سات سال کی عمر میں قرآن مجید کی تعلیم حاصل کی، خاندانی روایات کے مطابق فارسی تعلیم کا آغاز ہوا۔ عمر گرامی ابھی صرف بارہ برس تھی کہ اسی دوران حضرت سید احمد شہید بریلویؒ کے مجاز وخلیفہ مولانا ولایت علی صادق پوری کی دیوبند آمد ہوئی، حضرت حاجی صاحب اسی عمر میں (جو کہ لڑکپن کی عمر ہوتی ہے، شعور بیدار نہیں ہوتا، حُسن وقُبح کی تمیز نہیں ہوتی) حضرت مولانا ولایت علی صاحب کے دست حق پرست پر بیعت ہوگئے اور مولانا کی نظرِ

*استاذ: ادارہ کہف الایمان بورابنڈہ، حیدرآباد

کیمیا اثر نے دل پر وہ گہرا اثر ڈالا، دامنِ فیض سے وابستہ ہو گئے۔ حتیٰ کہ حضرت مولانا ولایت علی صاحب سہارنپور تشریف لے گئے تو حضرت حاجی صاحب بھی پیرومرشد کے ہمراہ سہارنپور پہنچ گئے۔

اسی کم سنی کی عمر میں بڑے بھائی کو فقر وسلوک کے راستے پر چلنا ناگوار معلوم ہوا، سہارنپور جا کر مولانا ولایت علی صاحب سے درخواست کر کے واپس لائے۔ گرچہ حاجی صاحب کو پیر کی دوری کا قلق ہوا، لیکن حضرت مولانا ولایت علی صاحب نے دل کے ویرانے میں جو عشق کی شمع روشن کی تھی، اسی روز سے جو شب بیداری کا عہدو پیمان کیا تو کبھی تہجد کی نماز قضا نہیں ہوئی۔

دہلی میں تعلیم

پھر اس کے بعد تعلیم کے حصول کے لیے دہلی چلے گئے۔ یہاں قیام کے لیے ایک ایسی مسجد کا انتخاب کیا جس میں ایک بزرگ کا مزار تھا۔ صاحبِ مزار سے استفادۂ روحانی شروع کیا۔ ایک طرف کتابی تعلیم کا سلسلہ جاری تھا، دوسری طرف سلوک کی منزلیں طے ہو رہی تھیں، لیکن اسی دوران والد محترم علیل ہو گئے۔ حضرت حاجی صاحب کو اطلاع ملی تو دیوبند واپس آ گئے اور اس طرح تعلیمی سلسلہ منقطع ہو گیا۔

خدمتِ خلق

والد محترم کے وصال کے بعد تعلیم جاری رکھنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی، تو خدمتِ خلق کو پیش نظر رکھتے ہوئے دوافروشی کی دوکان کھول لی۔ بہ ظاہر تو عطار کی دوکان تھی، لیکن ایک قرآنی خانقاہ بھی، جہاں حاجی صاحب بیشتر اوقات قرآن مجید کی تعلیم میں گزارتے۔

تصوف وسلوک میں مقام

حاجی صاحب کے پیر میاں جی کریم بخش رام پوری انہی دنوں دیوبند تشریف لائے۔ حضرت حاجی صاحب ان بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوئے، ملاقات کا شرف حاصل کر کے واپس ہوئے۔

ادھر حضرت میاں جیؒ نے خواب میں دیکھا کہ آسمان پر سے ایک بڑا ستارہ میری گود میں گر گیا ہے، صبح کو اپنے ارادت مندوں کے حلقہ میں حضرت میاں جی نے فرمایا کہ کوئی سید مجھ سے بیعت ہوگا، لوگوں کو اس سے بہت فیض پہنچے گا، وہ متبعِ سنت ہوگا اور اس سے دین کے بہت سے کام ہوں گے، دنیوی جھگڑوں سے بچے گا، خاندان کو روشن کرے گا۔ (تذکرۃ العابدین، نذیر احمد دیوبندی: ٦٧، بحوالہ تاریخ دار العلوم دیوبند: ٢ / ٢٢٢)۔ اس طرح حاجی عابد حسین صاحبؒ میاں جی کریم بخش سے بیعت ہوئے۔

شادی خانہ آبادی اور خلافت

آپ نے اپنے جدامجد حضرت سید شاہ بندگی محمد ابراہیم کی اولاد میں ایک خاتون سے نکاح کیا، اپنے شیخ میاں کریم بخش سے بیعت کروایا۔

اہلیہ کی کرامت

اہلیہ حضرت میاں جی کے دامن سے کیا وابستہ ہوگئیں، عجیب وغریب حالات کا ظہور ہونے لگا، جب بھی درود شریف پڑھتی تھیں، حضور پُرنور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی زیارت ہوجاتی تھی، ظاہر ہے کہ درود شریف کا ورد نہ جانے کتنے مرتبہ ہوتا، اس قدر زیارتیں کیں، خود میاں جی ان کے پاس تشریف لے جاتے اور فرماتے کہ میری یہ درخواست نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں عرض کردینا۔

پہلا حج

حاجی صاحب نے پہلا حج مع اپنی اہلیہ کے کیا۔ ایک دفعہ ان محترمہ کو نبی آخرالزماں کی زیارت ہوئی تو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: "ہمارے یہاں آؤ"۔ اس طرح حاجی صاحب کے ہمراہ حج پر تشریف لے گئیں۔

حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ سے خلافت:

حضرت حاجی عابد حسینؒ کو متعدد بزرگوں مثلاً: میاں کریم بخشؒ، پھر ان کے بعد حضرت شاہ محمد امام قادری مدراسیؒ اور حضرت راج خان صاحبؒ سے خلافت مل چکی تھی۔ ۱۲۸۴ھ میں جب چھٹا سفر حج کیا، مکہ مکرمہ پہنچ کر حج ادا کیا، پھر مدینہ منورہ میں تقریباً ایک سال قیام رہا۔ ایک دن خواب میں اللہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بشارت ہوئی کہ ''اپنا سلسلہ احسان وسلوک حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ سے ملاؤ اور ہندوستان جاؤ۔''

چنانچہ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی سے وہیں ملاقات میں کسبِ فیض کیا، خلافت عطا ہوئی۔ شیخ نے فرمایا: ہندوستان چلے جانا، ہاں! تم سے لوگوں کو بے انتہا فائدہ ہوگا، ہندوستان خالی مت کرو اور جامع مسجد دیوبند بھی تمہارے بغیر تعمیر نہیں ہوسکتی۔

اہلیہ کا انتقال

حضرت حاجی عابد حسینؒ کی اہلیہ محترمہ جو بڑی عابدہ زاہدہ تھیں، جن کو درود شریف پڑھتے ہی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی زیارت ہوا کرتی تھی، مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ آتے ہوئے راستے میں انتقال فرماگئیں۔

دوسری شادی

شیخ حاجی امداد اللہ صاحب نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ شادی ضرور کر لینا، چنانچہ اپنے مرشد کے حکم اور منامی بشارت کے مطابق ہندوستان تشریف لائے، جامع مسجد بھی تعمیر کرائی اور شادی بھی کر لی۔ (تذکرۃ العابدین: ۶۳)

زہد، اطاعت اور معمولات

حضرت حاجی صاحب کا ۶۰ برس تک مسجد میں قیام رہا۔ مشہور ہے کہ ۳۰ سال تک آپ کی تکبیر اولیٰ فوت نہیں ہوئی۔ نماز تہجد کا ایسا التزام کہ ۶۰ سال تک قضا کی نوبت نہیں آئی۔ صاحب کشف و کرامات بزرگ تھے، رشد و ہدایت اور تذکیر و تزکیہ قلب کے علاوہ آپ کو عملیات میں زبردست ملکہ حاصل تھا۔ مختلف النوع کاموں کی کثرت کے باوجود ضبط اوقات کا بڑا التزام تھا اور ہر کام ٹھیک وقت پر انجام دیتے تھے۔

معمولاتِ یومیہ:

آخر شب میں بیدار ہوتے، نماز تہجد اور اوراد و وظائف سے فارغ ہو کر فجر کی نماز چھتہ کی مسجد میں ادا فرماتے۔ نماز کے بعد تلاوت فرما کر حجرے سے باہر تشریف لاتے، بیعت کے خواہش مندوں کو بیعت کرتے، تعویذات عطا کرتے، دوپہر تک سلسلہ جاری رہتا۔ بعد ظہر متوسلین طریقت حاضر ہوتے، اس وقت ذکر و شُغل ہوتا اور عصر تک جاری رہتا۔ بعد مغرب ختم خواجگان کا معمول تھا، عشاء کے بعد اول وقت سو جاتے تھے۔ تعویذات کے ضرورت مند بعض اوقات نہایت پریشان کرتے، مگر اخلاق و تواضع اور خدا ترسی کے ساتھ برداشت کرتے۔

اتباعِ سنت کا غایت درجہ اہتمام تھا، ایک مرتبہ معلوم ہوا کہ مریدین میں سے حاجی محمد انور دیوبندیؒ نے نفس کشی کے طور پر کھانا پینا ترک کر دیا ہے تو آپ نے بتاکید فرمایا: یہ امر سنت کے خلاف ہے، بطریق مسنون کھانا پینا ضرور چاہیے خواہ تھوڑا ہی کیوں نہ ہو۔

شخصیت کا اثر

حاجی صاحب دیوبند میں ایک ذی وجاہت، صاحب اثر شخص تھے، آپ کی بزرگی کا سکہ دیوبند کے ہر چھوٹے بڑے، مرد و عورت، بچے و بوڑھے کے دل پر تھا۔ عابد و زاہد ہونے کے ساتھ بڑے عامل تھے۔ آپ کی تعویذوں کا روحانی اثر بیماروں کے لیے تریاق کا کام کرتا تھا۔ آپ کی صورت دیکھ کر خدا یاد آتا، پابندیٔ وضع، استقلالِ طبع، اولوالعزمی، خوش تدبیری آپ کی مشہور تھی۔ باوجودیکہ دنیا کو ترک کر دیا تھا، مگر کوئی آپ سے مشورہ

طلب کرتا تو اس میں ایسی اچھی رائے دیتے جیسے کہ بڑے ہوشیار دنیادار۔(انوار قاسمی:۱/ ۳۵۰،۳۵۱،مطبوعہ لاہور)

استغناء اور سخاوت

سوانح قاسمی میں لکھا ہے کہ اہل دیوبند کو آپ سے کمال درجے کی عقیدت تھی،آپ کی ذات سے مخلوق خدا کو بے انتہا نفع ہوا،غیر مذہب والے بھی آپ کے تعویذوں کے معتقد تھے۔گھر بار،زمین،باغ جس قدر آپ کی ملک میں تھا،سب کا سب راہِ خدا میں دے کر محض خدا پر تکیہ کیا ہوا تھا۔(سوانح قاسمی:۲/ ۲۳۹،۲۴۱،مطبوعہ نیشنل پریس دیوبند)

آپ کی کرامات

ایک فوجی رسالدار اپنی اہلیہ کو لے کر دیوبند حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا،انہوں نے بتایا کہ میری اہلیہ بارہ سال سے بیمار ہیں،بے شمار علاج کیے،لیکن بیماری نہیں گئی۔بارہ سال سے حمل کی صورت بھی نمایاں ہے،معلوم ہوتا ہے کہ چار مہینے کا بچہ پیٹ میں ہے،دوائیاں بھی حمل کی تصدیق کرتی ہیں،علاج کے لیے حاضر ہوا ہوں۔حضرت حاجی صاحب نے فرمایا:ٹھہر جایئے،مغرب کی نماز کے بعد علاج کا انتظام کیا جائے گا۔چنانچہ حسب ارشاد حاجی صاحب نے ایک نقش جنوں کو حاضر کرنے کے لیے روشن کیا اور اس عورت کے سامنے رکھا گیا۔ابھی نقش روشن ہی ہوا تھا کہ زوردار آمد محسوس ہوئی،معلوم ہوتا تھا کہ مکان گر جائیں گے اور چھپر اڑ جائیں گے،لوگ ڈر گئے؛لیکن نقش پر اس آندھی کا کوئی اثر دکھائی نہیں دیا اور وہ روشن ہی رہا۔

تھوڑی دیر بعد وہ عورت نہایت گرج دار آواز قہر آلود لہجہ میں گویا ہوئی،مجھے کیوں طلب کیا ہے؟سن لو!میں جنوں کا امیر ہوں،میرے ساتھ بہت بڑا لشکر ہے،میں ابھی جو چاہوں وہ کرسکتا ہوں،حضرت حاجی صاحب نے اس تند و تلخ گفتگو کا جواب نہایت متانت اور وقار کے ساتھ دیا اور کہا کہ وہ درست ہے،ہم تو یہ جاننا چاہتے ہیں کہ آپ اس عورت کو کیوں ستاتے ہیں،اس کا کوئی قصور ہوا ہو تو معاف کردیں۔

قتل کا الزام

جنوں کے امیر نے جواب دیا:ہرگز نہیں،آپ میرے ساتھ انصاف نہیں کر رہے ہیں،آپ کو معلوم ہے کہ اس عورت نے میرے بارہ سالہ لڑکے کو قتل کر دیا ہے،جب میرا لڑکا بلی بن کر سیر و تفریح کر رہا تھا،ایک دن اس کے گھر بھی پہنچ گیا،اس نے طوطا پالا تھا،وہ بلی کو دیکھ کر بھڑک گیا،اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ اس بلی کو مار دیا،اس وقت سے غصہ میں ہوں،لیکن مسلمان سمجھ کر زیادہ ایذارسانی اور تکلیف دہی سے باز رہا۔

حاجی صاحب نے فرمایا کہ آپ اس کا قصور معاف کردیں،اس نے کہا:ہرگز نہیں،پھر غصہ میں کہا:حاجی

صاحب! آپ مجھ کو رخصت کر دیجیے ورنہ جماعت کی نماز سے محروم ہو جاؤں گا، حاجی صاحب نے فرمایا: میں بھی نماز کے لیے جاؤں گا، سنئے آپ بھی مسلمان یہ بھی مسلمان، آپ اس کا قصور معاف کر دیجیے، جنوں کے امیر نے حضرت حاجی صاحب کی بات مانتے ہوئے کہا: اچھا معاف کر دیا۔ حاجی صاحب نے نقش بجھا دیا اور نماز کے لیے تشریف لے گئے۔

نماز کے بعد عورت نے جن کی بات کی تصدیق کی۔ صبح وہ عورت بالکل تندرست ہوگئی۔ چھ مہینہ کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس کو نرینہ اولاد عطا کی، اظہارِ تشکر کے لیے میاں بیوی خدمت اقدس میں شیرینی لے کر حاضر ہوئے اور حاجی صاحب سے بیعت ہو گئے۔

منصور پور کا مقدمہ

منصور پور ضلع مظفر نگر کا مشہور قصبہ ہے۔ یہاں کے رئیس (یہ مولانا قاری محمد عثمان صاحب صدر جمعیۃ علماء ہند کے پردادا تھے) پر ایک مقدمہ تھا۔ مظفر نگر کے سکندر شاہ مجذوب، رئیس منصور پور کے دشمن تھے، ہر شخص ناامیدی کا شکار تھا، سب کو یقین ہو چلا تھا کہ رئیس صاحب بچ نہیں سکیں گے، مقدمہ سے بری ہونے کی حضرت حاجی صاحب سے دعا کرائی گئی، حضرت حاجی صاحب نے دعا کی اور اللہ تعالیٰ کا فضل شاملِ حال ہوا، منصور پور کے رئیس بے داغ بچ گئے۔

دارالعلوم دیوبند کا پس منظر و تاسیس

۱۸۵۷ء کے خونی انقلاب کی داستان سے ہر شخص واقف ہے، جب انگریزوں کے ہاتھوں دہلی اجڑ گئی تھی، مسلمانوں کی سیاسی بساط پلٹ دی گئی، اسی وقت دہلی کی علمی مرکزیت بھی ختم ہوگئی۔

بزرگوں کی فکر

اس وقت کے اہل اللہ اور خصوصیت سے بزرگوں کو جو اس خونیں انقلاب کے چشم خود گواہ تھے، ان کو یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ احیاءِ علوم دین کے کاز کو کس طرح آگے بڑھایا جائے۔ اس مجموعی صورتحال کو دیکھنے سے یہ پتہ چلتا تھا کہ اب علم دین کا خاتمہ ہو چکا، نہ کوئی پڑھ سکے اور نہ کوئی پڑھا سکے، بڑے بڑے شہروں کے علمی مرکز مٹ چکے تھے۔ علماء پریشان، کتب مفقود، جمعیت نایاب، اگر کسی کے دل میں شوقِ علم اور طلب کی ہمت ہوئی تو کہاں جائے اور کس سے سیکھے؟ اور یوں نظر آتا تھا کہ بیس تیس برس میں جو علماء بقید حیات ہیں اپنے وطن اصلی (جنت) کو سدھار جائیں گے، تب کوئی اتنا بتلانے والا بھی نہ رہے گا کہ وضو کے کتنے فرض ہیں اور نماز میں کیا واجب ہے؟

فضلِ الٰہی

ایسی پریشانی اور مایوسی اور نا امیدی میں فضلِ الٰہی نے جوش مارا اور رحمتِ خداوندی کا دریا امنڈ آیا اور ابر فیضِ قدَرِ کامل موسلا دھار برسا اور اپنے بندگانِ مقبول کو اس کام کی طرف متوجہ فرمایا، اور اپنا ابر کرم اس مدرسہ دیوبند کی بناء کی شکل میں ظاہر فرمایا۔ اس زمانہ میں مولوی فضل الرحمن، مولوی ذو الفقار علی صاحب، اور حاجی محمد عابد حسین صاحب نے یہ تجویز پیش کی کہ ایک مدرسہ دیوبند میں قائم کریں۔

اولین محرک

دار العلوم دیوبند کے تاسیسی رکن حضرت مولانا ذو الفقار علی دیوبندیؒ نے اپنے عربی رسالہ **الهدية السنية فی ذكر المدرسة الإسلامية الديوبندية** میں لکھا ہے کہ: جب اللہ تعالیٰ نے اس خطے میں خیر برپا کرنے اور دینی علوم وفنون کے احیاء کے ذریعے بندوں کی رشد وہدایت کا ارادہ کیا تو الحاج سید محمد عابد صاحبؒ کے دل میں اس مدرسے کے قیام کا خیال القاء فرمایا۔

خواب میں بشارت

ایک دفعہ حضرت حاجی صاحب مسجد میں چلّہ میں تھے، ان کو ایک مدرسہ قائم کرنے کا الہام ہوا۔ آپ نے خواب میں نبی آخر الزماں ﷺ کی زیارت کی، آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ: " یہاں ایک مدرسہ دین کی بقاء اور ترویج کے لیے قائم کیا جائے، اللہ تعالیٰ مدد فرمائیں گے۔

مولانا قاسم نانوتویؒ کا انتخاب

پھر آگے لکھتے ہیں: پھر اللہ تعالیٰ نے اس مدرسہ کے استحکام اور علوم دینیہ کے احیاء کے لیے شیخ اکبر مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کو منتخب فرمایا۔ (الهدية السنية فی ذکر المدرسة الديوبندية: ۲، ۳، حضرت مولانا ذو الفقار علی دیوبندی، مکتبہ محمودیہ لاہور، عکس طباعت، ۱۳۰۷ھ)

تحریکِ چندہ اور افتتاح

سوانح قاسمی میں لکھا ہے کہ چندہ فراہمی کے سلسلے میں سب سے پہلے جس شخصیت نے عملی اقدام کیا، وہ حضرت حاجی عابد حسین صاحبؒ تھے۔

ایک دن بوقت اشراق رومال کی جھولی بنا کر آپ نے اس میں تین روپے ڈالے اور چھتہ مسجد سے تن تنہا مولانا مہتاب علیؒ کے پاس تشریف لائے جنھوں نے چھ روپے عنایت کیے اور دعا کی۔ پھر بارہ روپے مولانا

فضل الرحمن صاحبؒ نے اور چھ روپے حاجی فضل حق صاحب نے دیئے۔ پھر وہاں سے اٹھ کر آپ مولانا ذوالفقار علیؒ کے پاس آئے اور انہوں نے فوراً بارہ روپے عنایت کیے۔ وہاں سے اٹھ کر یہ درویش بادشاہ صفت محلہ ابوالبرکات پہنچے، دوسو روپے جمع ہوگئے، اور شام تک تین سو روپے۔ یہ قصہ بروز جمعہ دوم ماہ ذوالقعدہ ۱۲۸۲ھ کا ہے۔ (سوانح قاسمی: مولانا مناظر احسن گیلانی: ۲/ ۲۵۸، ۲۵۹)

ایمانی فراست

اس وقت سے ڈیڑھ سو سال پہلے عوامی چندے کی بنیاد حضرت حاجی صاحب نے ایک تعلیمی ادارہ قائم کرنے کی ڈالی، جو حکومت کے اثر سے آزاد ہو۔ آنے والے عوامی اور جمہوری دور کے پیش نظر یہ ایک زبردست ایمانی فراست اور پیش بینی تھی، بجائے سابقہ اوقاف کے طریقے کے یہ عوامی چندہ کا یہ طریقہ کار موجودہ دور کے حالات کے تناظر میں نہایت مفید اور مستحکم تھا، جس سے آج تک دینی مدارس چل رہے ہیں۔

افتتاحِ مدرسہ

بالآخر ۱۵ محرم الحرام ۱۲۸۳ھ بروز جمعرات مطابق ۳۱ مئی ۱۸۶۶ء کو قصبہ دیوبند کی چھتہ مسجد میں نہایت سادگی کے ساتھ مدرسہ عربی کا افتتاح عمل میں آیا۔

اولین اساتذہ وطالب علم

تدریس کے لیے سب سے پہلے جس استاد کو مقرر کیا گیا وہ حضرت مولانا مُلّا محمد محمود دیوبندیؒ تھے اور اس مدرسہ کے پہلے طالب علم کا نام محمود حسن تھا جو بعد میں شیخ الہندؒ کے نام سے پوری دنیا میں جانا پہچانا گیا۔

بظاہر یہ ایک مدرسہ کا بہت ہی مختصر اور محدود پیمانے پر افتتاح تھا؛ مگر درحقیقت ہندوستان میں دینی تعلیم کی ایک عظیم تحریک کا آغاز تھا۔

اولین مہتمم

حضرت حاجی صاحب مدرسہ کے اولین مہتمم ہوئے، آپ کے اثر ووجاہت سے دارالعلوم کو بہت فائدہ ہوا اور اس کا قدم ترقی کی جانب گامزن رہا۔

دیوبند کی جامع مسجد کی تعمیر

دیوبند کو اگرچہ مسجدوں کا شہر کہا جاتا ہے (ایک قصبہ میں سینکڑوں مسجدوں کا ہونا باشندگانِ دیوبند کی سعادت ہے)، لیکن قصبہ میں کوئی جامع مسجد نہیں تھی۔ دارالعلوم کی تاسیس کے بعد حضرت حاجی صاحب کی توجہ

جامع مسجد کی تعمیر کی طرف ہوئی، اس کے لیے مشورے ہوئے اور اتفاق رائے سے ایک بلند جگہ کا انتخاب کیا گیا (وہی جامع مسجد آج بھی دیوبند کی جامع مسجد ہے)۔ جس جگہ کا انتخاب ہوا وہاں متعدد مکانات بنے ہوئے تھے۔ مکان والوں سے جب جگہ مانگی گئی تو انہوں نے انکار تو نہیں کیا، البتہ اس کے عوض زمین اور مکان کا مطالبہ کر رہے تھے۔ چنانچہ حاجی صاحب مکان والوں سے ملاقات کر کے زیادہ غور وخوض کیے بغیر برجستہ فرمایا: میں اپنا مکان اور نشست گاہ تم کو دیتا ہوں تم مسجد کے لیے جگہ دے دو۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

تعمیر کا آغاز

پھر حاجی صاحب کا سفر بیت اللہ کا ارادہ ہوا، آبائی جائیداد رشتہ داروں میں تقسیم کر دی۔ اسی حج بیت اللہ کے موقع سے ۱۲۴۸ھ میں حاجی امداد اللہ صاحب سے ملاقات اور بیعت ہوئی۔ سید الطائفہؒ نے فرمایا: ہندوستان خالی مت کرو اور مسجد کا کام بھی تمہاری مدد کے بغیر نہیں ہوسکتا۔ واپس ہندوستان تشریف لائے، مسجد کے بارے میں دریافت کیا تو پتہ چلا کہ ابھی کوئی آمدنی مسجد کے نام سے نہیں ہے اور نہ وہ جگہ پوری طور پر خالی ہوئی۔ کچھ دنوں کے بعد حاجی صاحب نے بذات خود بنیاد کی کھدائی شروع کی۔ بعض لوگ طنز کرنے لگے کہ حاجی صاحب گڈھے کھدوا کر کیا اس میں لوگوں کو ڈال دیں گے؟

مسجد کے لیے چندہ جمع کرنے کے لیے جناب عبد الخالق صاحبؒ کو ان کی مرضی کے مطابق رکھا گیا۔ بالآخر، پرانے زمانے کے (ڈیڑھ سو سال قبل) کے تخمینے کے اعتبار سے ڈیڑھ لاکھ کی مسجد تیار ہوگئی۔ آج بھی یہ پرشکوہ جامع مسجد دیوبند میں دار العلوم کے قریب موجود ہے۔ (تذکرہ العابدین: ۵۳، ۵۴، مطبوعہ: ۱۳۱۷ھ)

منصب اور وصال

دار العلوم دیوبند کے اولین محرک اور بانی ہونے کے علاوہ آپ دار العلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے رکن رکین اور پہلے مہتمم بھی رہے۔ دار العلوم دیوبند کا اہتمام تین مرتبہ آپ کے سپرد ہوا، آپ کی کل مدتِ اہتمام تقریباً دس سال ہے۔ آخر میں بے پناہ مصروفیات کی وجہ سے مستعفی ہو گئے۔

وفات

بروز جمعرات ۲۷ ذی الحجہ ۱۳۳۱ھ مطابق ۲۷ نومبر ۱۹۱۳ء کو بعمر ۸۱ سال وفات پائی۔ آپ دار العلوم کے شمال میں قبرستان قاسمی کے متصل بہ جانب شمال مشرق ایک احاطہ میں مدفون ہیں، جو آپ کے نام کی نسبت سے مزار عابدی سے موسوم ہے۔

افاداتِ اکابر

اشرف المجالس

ترتیب وپیش کش: مفتی محمد احمد علی صاحب قاسمی*

مخدومنا ومحبوبنا حضرت مولانا محمد عبد القوی صاحب مدظلہ العالی ہر جمعہ بعد نمازِ عصر ہفتہ واری اصلاحی مجلس میں حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کے ”منتخب ملفوظات“ (مرتبہ حضرت مولانا یحییٰ نعمانی زید مجدہٗ) کی کچھ توضیح وتشریح کے ساتھ تعلیم فرماتے ہیں، اُن ملفوظات کو قارئینِ اشرف الجرائد وعامۂ مسلمین کے لئے ترتیب دیا گیا ہے۔

ازمرتب

(۵۷) ذکر اللہ قوتِ ایمانی اور نورِ قلبی کا سبب ہے

ارشاد فرمایا:۔ذکر کرو، ذکر سے علم میں، عقل میں، وقت میں، اور سب کاموں میں برکت ہوتی ہے، ہر چیز میں برکت ہے، جو تھوڑا سا ذکر صبح میں کرلے گا، بڑی برکتیں پائے گا، یہی بات حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی فرمائی ہے ”کہ وہ ذرا سی بات جو تمام تصوف کا خلاصہ ہے؛ وہ یہ ہے کہ جو کام کرنے کے ہیں، ذرا ہمت کر کے ان کو کرلیا کریں، اور جو گناہ چھوڑنے کے ہیں ہمت کر کے انہیں چھوڑ دیا کریں، اور تھوڑا وقت ذکر اللہ کے واسطے رکھیں، یہ تین چیزیں ہوجائیں تو پھر آدمی ”ولی اللہ“ ہوجائے گا، جو کرنے کے کام ہیں، کتنی بھی سستی کا ہلی ہو، ہمت کر کے کرلیں، اور جو نہیں کرنے کے کام ہیں چاہے کتنا بھی تقاضا ہو، ہمت کر کے چھوڑ دیں، یہ دو تو اصل ہیں، اور اس کے ساتھ قوتِ ایمانی پیدا کرنے اور نورِ قلبی پیدا کرنے کے واسطے تھوڑی دیر اللہ کا ذکر، یہ تین کام کرلو، تو فرماتے ہیں کہ یہ خلاصہ ہے تصوف کا، اب اگر کوئی اتنا بھی نہیں کرنا چاہے کوئی تو پھر کام کیسے ہوگا؟

(۵۸) اصل مقصود اصلاحِ نفس ہے؛ صحبت سے حاصل ہو یا بدونِ صحبت

ارشاد فرمایا: حضرت مولانا عبد الحیٔ صاحب فرنگی محلی رحمۃ اللہ علیہ باقاعدہ کسی شیخ کے تربیت یافتہ تو نہیں تھے؛ لیکن کتاب وسنت کے زبردست حکیم وفہیم اور دانا تھے، اور اسی کی برکت سے علم وعمل اور تقویٰ ان کی زندگی میں آگیا، دل کی پاکیزگی بھی آگئی تھی، ہر قسم کے غل وغش سے قلب پاک ہوگیا تھا، بس مقصود حاصل ہوگیا، اِسی

* استاذ شعبہ عالمیت ادارہ اشرف العلوم حیدرآباد

سے بندہ اللہ کا پیارا اور چہیتا ہو گیا، یہی وہ حالت ہے جس کو نصیب ہو جائے تو سمجھو اس کا کام بن گیا، اور بسا اوقات ایسا بھی ہوتا نظر آرہا ہے کہ بعض لوگ برسہا برس اہل اللہ کی صحبت میں رہ کے بھی روحانی بیماریوں کی اصلاح نہیں کر پائے، معلوم ہوا کہ مقصد حاصل نہیں ہوا، اور اگر کسی کو اس کے بغیر بھی حاصل ہو جائے تو کیا کہنے، اصل چیز کیا ہے، وہ دیکھو، چاہے وہ کسی طرح حاصل ہو جائے۔

(۵۹) بڑے بزرگ لوگوں کا احترام حق تعالیٰ کی تعظیم کا ایک حصہ ہے۔

ارشاد فرمایا:۔ بڑے بزرگ لوگوں کا احترام کرنا چاہیے، عزت کے ساتھ ان سے ملنا چاہیے، سماج میں پہلے اس کا بہت رواج تھا کہ بڑے بزرگ لوگوں کا احترام کیا جاتا تھا، اور لوگ اس معاملے میں تو مسلم غیر مسلم بھی نہیں دیکھتے تھے، ہر کوئی بس بزرگ آدمی ہے تو اس کی عزت واحترام کرتا تھا، آج کل یہ سب چیزیں ختم ہو گئی ہیں، بالخصوص اگر بوڑھے علماء ہوں، یا نیک آدمی بوڑھا ہو تو اور بھی زیادہ عزت کرنی چاہیے، حدیث شریف میں ہے ان من اجلال اللہ اکرام ذی الشیبۃ المسلم۔ یعنی معمر و بزرگ مسلمان کی عزت وتکریم دراصل اللہ تعالیٰ کے اجلال وتکریم ہی کا ایک حصہ ہے۔

(۶۰) اپنے عیوب پر نظر رکھنے والے کو تنقید کی پرواہ نہیں ہوتی

ارشاد فرمایا:۔ انسان کا مزاج یہ ہے کہ اگر کسی نے کچھ برا کہا، بدنام کیا، تو آدمی میں ٹینشن پیدا ہو جاتا ہے، پھر یہ سب سوالات پیدا ہونا شروع ہو جاتے ہیں؛ کیوں برا کہا؟ کون کون اس میں شریک تھے؟ کس وجہ سے ایسا کہا گیا؟ اور اس کو ختم کیسے کیا جائے؟ وغیرہ، اس قسم کی چیزیں بار بار جو ذہن کو ستاتی ہیں وہ اپنے آپ کو کسی مقام اور مرتبے پر فائز سمجھنے کی وجہ سے ستاتی ہیں، اس سے تو میری بڑی سبکی اور خفّت ہو گئی، اب اس کا حل نکالنا چاہیے، اس کا کوئی نہ کوئی جواب ہونا چاہیے، آدمی اِن چیزوں میں لگ جاتا ہے، مگر اس کا فائدہ کیا ہے؟ اس میں وقت اور ذہن خراب ہونے اور اپنے بہت سے اچھے کام بھی نہ ہو سکنے کے علاوہ اور کیا ہوتا ہے، مگر آدمی کا مزاج بس کچھ ایسا ہی ہے، اسی لیے حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں: ''اپنی حقیقت میں غور کیا کریں، اور سوچا کرے کہ جو برائیاں لوگ کرتے ہیں میں تو اس سے بھی زیادہ برا ہوں، یعنی اگر کوئی اپنے حالات، کمزوریوں اور کوتاہیوں پر نظر رکھے تو ایسی صورت میں وہ اُس کو خود سب سے زیادہ نظر آرہے ہیں، دوسرا اُس کو کیا دیکھے گا؟ دوسرا ہم کو اتنا تو نہیں جان سکتا جتنا خود ہم اپنے آپ کو جانتے ہیں، یہ سوچنا چاہیے، اور اللہ کا شکر بھی ادا کریں کہ اس نے ہمارے بڑے بڑے عیوب چھپا کر ہمیں عزت سے رکھا ہے، ورنہ تو ہم کیا ہوتے کس لائق ہوتے؟۔

افاداتِ اکابر

ارشاد السالکین

''خانقاہِ سعیدیہ'' میں ہر شمسی مہینے کے دوسرے اتوار کو صبح ۹؍ بجے تا شب ۹؍ بجے اصلاحی مجلس منعقد ہوتی ہے، اس میں جنوبی ہند کی تمام ہی ریاستوں سے تقریباً تین سو سالکین شرکت کرتے ہیں، صبح ۱۰ تا ۱۲؍ بجے کی نشست میں شرکاء کے پوچھے گئے سوالات کے جواب مرشدی حضرت اقدس مولانا محمد عبد القوی صاحب مدظلہ العالی خود دیتے ہیں، جو بہت ہی نافع ہوتے ہیں، علماء وعوام سب ہی اس کے قائل ہیں، اس لئے مولانا مفتی محمد احمد علی صاحب قاسمی زید فضلہٗ استاذ ادارۂ ہٰذا و مجازِ حضرت والا نے اِن کو جمع کر کے قارئین کے فائدے کے لئے شائع کیا ہے۔ از مرتب

نوافل کا اہتمام کیسے کریں

سوال (۹۴): نفلی عبادتوں کا اہتمام کیسے کروں؟ اس کا طریقہ کیا ہے؟

جواب:۔ طریقہ یہی ہے کہ نفلی عبادتوں کا اہتمام بھی ویسے ہی کرنا جیسے فرض کا کر رہے ہیں، جن نمازوں سے پہلے اور بعد کی سنتیں ہیں پڑھنے کا اہتمام کرو، مغرب کے بعد دو ہی رکعت پڑھ رہے ہیں تو ابھی اس سے کام چل جائے گا، لیکن اللہ کا تقرب کیسے حاصل ہوگا؟ اللہ کا تقرب حاصل کرنے کے لیے نوافل کا راستہ دکھایا گیا ہے ،اس لئے اوابین کا اضافہ تقرب الی اللہ کا ذریعہ ہے، اس کا طریقہ بس یہی ہے کہ ارادہ کر کے شروع کردو، البتہ ایک دم بہت زیادہ مقدار میں شروع مت کرو، تھوڑے تھوڑے سے مشق کرو اور اس کی عادت ڈالو، حضور علیہ السلام نے فرمایا: فلاں شخص کی طرح مت ہو جاؤ کہ پوری رات نفلیں پڑھ رہا تھا اب کچھ بھی نہیں پڑھ رہا، (متفق علیہ) چار سے شروع کرو، چار پر مشق ہوگئی، جی لگ گیا، جم گئے تو دھیرے دھیرے بڑھاؤ؛ کیوں کہ ایک دم سے بوجھ ڈالنے سے جب تک وہ جذبہ چلے گا تب تک وہ چلے گا، جذبہ ٹھنڈا پڑے گا تو وہ کام بھی اس کے ساتھ ختم ہو جائے گا، اس لیے ایسا نہ ہونا چاہیے، اعتدال کے ساتھ اپنی عبادتوں میں اضافہ کرو، مگر کرو، آپ لوگ تو سب راہ روانِ راہِ سلوک ہیں، اللہ کے راستے میں چلنے کا عزم رکھتے ہیں، تبھی سفر کر کے دور دراز سے یہاں پہنچتے ہیں، مقامی بھی ہیں تو پابندی سے یہاں پہنچتے ہیں، کیوں پہنچتے ہیں؟ بھئی! کوئی ارادہ ہے؟ اسی

لیے کہ ہم اللہ کی راہ میں ترقی کرنا چاہتے ہیں، اللہ کے محبوب بندے بننا چاہتے ہیں، اللہ تعالی کا قرب اور ولایت کو حاصل کرنا چاہتے ہیں، جب یہ ارادہ ہے تو اللہ ہی ہم کو طریقہ بتاتا ہے تو اللہ کے طریقہ بتانے کے بعد پیر صاحب کیا طریقہ بتائیں گے؟ تو وہی طریقہ ہمیں آپ کو بتانا پڑے گا، وہ کیا ہے؟ **لا یزال یتقرب العبد بالنوافل حتی احببتہ** (بخاری) فرائض سے زیادہ کسی چیز سے اللہ کو راضی نہیں کیا جا سکتا، اور فرائض کے بعد جتنا نفل عمل بڑھا لو گے اتنے مقرب ہو جاؤ گے، علماء جو گرامر سمجھتے ہیں وہ اس کا مطلب سمجھ سکتے ہیں، مسلسل بلا انقطاع مقرب بنتا رہتا ہے، بندہ ہر گھڑی اللہ کے قریب ہوتا رہتا ہے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ میں اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے، میں اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، میں اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے، اور میں اس کا پیر بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے، محبت کی انتہائی تعبیر ہے اتنا بول دینے کے باوجود بندہ کو پوچھنا پڑے گا کہ نفلیں پڑھنے کا کوئی طریقہ ہے؟ میں نہیں سمجھتا کہ اس کے بعد بھی کوئی طریقہ ہو سکتا ہو۔

نماز اور عید کے بعد مصافحہ کا رواج

سوال (۹۵):۔ہمارے یہاں نماز کے بعد اور عیدین کی نماز کے بعد مصافحہ کا رواج زور پکڑا ہوا ہے، اس سلسلہ میں ھمارا کیا طرزِ عمل ہونا چاہیے۔ راہنمائی فرمائیں۔

جواب:۔کوئی حرج کی بات نہیں ہے، بات یہ ہے کہ ہمارے علماء کرام جو منع فرماتے ہیں وہ اس وجہ سے منع فرماتے ہیں کہ لوگوں نے یہ عمل اتنا ضروری سمجھ لیا ہے جیسے وہ واجب ہو، یا یہ کہ عبادت کا یا عید کی نماز کا کوئی حصہ ہو، جیسے دو رکعت ہے، خطبہ ہے، اچھے کپڑے پہننا ہے، خوشبو لگانا ہے، عید گاہ جانا ہے، یہ جیسے اعمالِ عید ہیں؛ اسی طریقے سے عوام الناس نے مصافحہ معانقہ کو بھی بعد نماز ایک عمل سمجھا ہے، تو اس کے دو پہلو ہیں؛ ایک ہے اظہارِ خوشی و مسرت، اس پہلو سے یہ کوئی بری بات نہیں ہے، اچھی بات ہی ہے، اور ایک پہلو عبادت کا جز سمجھنا ہے، اس پہلو سے یہ ایک اعتقادی خرابی ہے، جو واجب الرد اور واجب الترک ہے، اگر وہ جزء عبادت سمجھ کے کر رہا ہے تو غلط ہے، اگر وہ خلوص و محبت میں کر رہا ہے تو بس محبت کا اظہار ہے، لوگوں کی عوام کے ذہنوں میں یہ سب نہیں ہے، علماء فرق سمجھتے ہیں، فرق بھی نہیں سمجھتے، ان کو کیا پتہ ہے کہ یہ عقیدہ یا عمل ہے، وہ عرف اور تہذیب کے حوالے سے جانتے ہیں، وہ اعتقادی خرابی کے طور پر نہیں ہے، پھر بھی اگر یہ اعتقادی خرابی کی حد تک پہنچ رہا ہے تو خطیب صاحب کو بتانا چاہیے، بتادیا کریں، جیسے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ جمعہ کے دن فجر

میں سورہ الم سجدہ اور سورۃ الدھر پڑھنا سنت ہے، اس میں اختلاف ہوا کہ کیا ہمیشہ پڑھنا چاہیے تو احناف نے کہا کبھی کبھی ترک کر دیا جائے؛ تا کہ لوگوں کو پتہ چلے کہ ضروری نہیں ہے، سنت ہے، شوافع نے کہا کہ ترک تو کبھی بھی نہ کیا جائے؛ البتہ امام کبھی کبھی بتا دیا کریں کہ ضروری نہیں؛ تا کہ ان کا علم و اعتقاد صحیح رہے، اور عمل برابر ہوتا رہے، اعتقاد کی سلامتی کے ساتھ وہ سنت جاری رکھنا چاہیے، تو ایک صاحب نے طریقہ یہ بتایا کہ کبھی کبھی ترک کر دو؛ تا کہ اعتقاد سلامت رہے، اور ایک میں یہ طریقہ بتایا کہ بول دیا کرو؛ تا کہ اعتقاد سلامت رہے، مگر سنت تو نہیں چھوڑی گئی، سنت جاری رکھی گئی، ایسے ہی اس قسم کے معاملات میں تشدد اختیار نہیں کرنا چاہیے، یہ مسئلہ حلال وحرام اور اعتقادی خرابی کا نہیں ہے، اور اعتقاد کا تعلق علم سے ہے، عمل سے نہیں، اس لیے لوگوں کو بتایا جاتا رہے کہ دیکھو بھی یہ نماز کے لوازمات میں سے نہیں ہے، نماز عید کے احکام میں سے نہیں ہے، البتہ یہ خوشی ومسرت کی تہذیب میں داخل ہے، جب بھی آدمی کسی سے خوش ہوتا ہے تو اسے گلے لگا لیتا ہے تو ویسا سمجھ کے مت کرو، ایسا سمجھ کے کر سکتے ہو، بالخصوص جب وہ عمومِ بلوی ہو جائے تو اس کے روکنے کی کوئی صورت بھی نہیں ہے، تو آسان طریقہ یہ ہے کہ اعتقاد کی خرابی کو ختم کر دیا جائے، باقی عمل میں تو برا نہیں ہے، عمل فی نفسہٖ برا نہیں ہے، بہر حال یہ مسئلہ علماء کو ذہن میں رکھنا چاہیے، اور اس معاملہ میں اعتدال اختیار کرنا چاہیے، سختی اور تشدد سے بچنا چاہئے، ناجائز بتانے کے بعد بھی لوگ کریں گے تو پھر یہ ہوگا کہ علم تو یہ کہہ رہا ہے کہ بدعت ہے، اور وہ بدعت کا مجرم بن رہا ہے، اور بدعت سے زیادہ شنیع اور خبیث کوئی گناہ نہیں، یہ سب سے مہلک گناہ ہے، اس کے علاوہ ایک انسانی اور نفسیاتی جذبات ہیں، کر لینے دو، کوئی حرج کی بات نہیں، اسی لیے بعض اکابر کا طریقہ یہ رہا کہ وہ عید گاہ میں تو نہیں ملتے؛ لیکن کوئی گھر پہ آ کے مل لے تو مل لیتے ہیں؛ کیونکہ اعتقادی خرابی کا جو خطرہ ہے وہ نماز سے متصل ہونے کی وجہ ہے، اور جب نماز سے متصل نہیں ہے تو پھر وہ ایک عام سی بات ہے، اس میں کوئی حرج کی بات نہیں ہے، لیکن امام وخطیب کو چاہیے کہ اگر لوگ وفورِ شوق اور جذبات سے آگے بڑھ کے ملنا چاہیں تم مل لینے میں کیا حرج کی بات ہے؟ یہ ملنا صرف محبت کے اظہار کے لیے ہے، اس کا نماز کے عمل سے عید کی سنتوں سے کوئی تعلق نہیں، ورنہ اگر آپ رد کر دیں گے تو وہ آپ سے بدگمان ہو جائیں گے، پھر ان کے دلوں میں کینہ پیدا ہو جائے گا، اور یہ اس سے بھی بڑا گناہ ہے۔

فقہ وفتاویٰ

آپ کے شرعی مسائل

از: مفتی محمد ندیم الدین قاسمی*

رات کے وقت جھاڑو لگانا اور ناخن کٹوانا

سوال: رات کے وقت جھاڑو لگانا اور ناخن کٹوانا اور بال درست کرانا کیسا ہے؟

جواب: دن رات کسی بھی وقت حسبِ ضرورت مذکورہ کام کئے جاسکتے ہیں۔ (نخبۃ المسائل، ۱/ ۶۲)

قرآن کریم میں بنی اسرائیل کا زیادہ تذکرہ

سوال: قرآن کریم میں بنی اسرائیل کا زیادہ تذکرہ کیوں ہے؟

جواب: امتِ محمدیہ کے احوال بنی اسرائیل کے حالات کے بہت مشابہ ہیں، نیز بنی اسرائیل نے جس طرح سرکشیاں کیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے مختلف انداز سے ان پر مواخذہ ہوا، اس طرح کے سبھی واقعات میں امتِ محمدیہ کے لئے بہت زیادہ عبرت وموعظت اور تنبیہات کا پہلو پایا جاتا ہے، اسی بنا پر قرآن کریم میں بہ کثرت حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کا تذکرہ وارد ہے۔ (نخبۃ المسائل، ۱/ ۱۰۷)

حدیث ’’من زَنیٰ زُنیٰ باھلہ‘‘ کی تحقیق

سوال: آج کل بہت سے بیانات میں یہ بات سنی جارہی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو شخص زنا میں مبتلا ہوگا تو اس کے بدلے میں اس کے گھر کی کسی خاتون کے ساتھ بھی یہی عملِ بد ضرور پیش آئے گا، اور اس بات کو لوگ بڑے زور وشور سے بیان کرتے ہیں تو سوال یہ کہ اس روایت کی حیثیت کیا ہے؟ اور اس کو بیان کرنا درست ہے یا نہیں؟ نیز یہ بھی بتایا جائے کہ مجمع عام میں موضوع یا ضعیف حدیث مطلقاً بیان کرنے کا شرعاً کیا حکم ہے؟

جواب: ’’من زَنیٰ زُنِیَ باھلہ‘‘ (یعنی جو شخص زنا کرے تو اس کے بدلے میں اس کی رشتہ دار خواتین کے ساتھ بدکاری کی جائے گی) اس جیسے مضمون کی سبھی روایتیں روایت اور درایت کے اعتبار سے منکر اور موضوع

* استاذ شعبہ عالمیت ادارہ ہذا

ہیں؛ کیوں کہ ان کی کوئی بھی سند کذاب اور مجہول راویوں سے خالی نہیں۔ نیز یہ قانونِ شریعت ’’وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی ‘‘یعنی (کسی جرم کا مواخذہ مجرم کے علاوہ سے نہیں کیا جائے گا) کے بھی صراحۃً خلاف ہے، اس لئے ایسی من گھڑت روایات کو بیان کرنا کسی بھی شخص کے لئے جائز نہیں ہے، ان کے بجائے صحیح روایات ہی بیان کرنی چاہیئے۔ البتہ ضعیف روایات جو موضوع کے درجے تک نہ پہنچی ہوں انہیں ترغیب وترہیب کے طور پر بیان کرنے کی گنجائش ہے۔ (نخبۃ المسائل، ۱/۱۳۱)

عالم یابزرگ کو اگلی صف میں جگہ دینا

سوال: عالم یا بزرگ کی تعظیم میں پہلی صف سے پیچھے ہٹ کر اگلی صف میں جگہ دینا کیسا ہے؟

جواب: بلا کراہت درست ہے، اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ (محقق ومدلل مسائل، ۲/۱۰۰)

بری کا مالک کون؟

سوال: بہ وقتِ نکاح دولہے والوں کی طرف سے لڑکی کے گھر بَری کے نام سے کچھ سامان مثلاً کھجور، کھوپرا، مصری یا بادام وغیرہ بھیجا جاتا ہے، توسوال یہ ہے کہ اس کا مالک کون ہے؟

جواب: یہ ہدیہ ہے اور لڑکی اس کی مالک ہے۔ (محقق ومدلل مسائل، ۲/ ۲۲۳)

سودی رقم بینک میں چھوڑنا

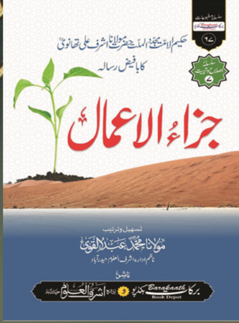
سوال: سودی رقم بینک میں چھوڑنا کیسا ہے؟

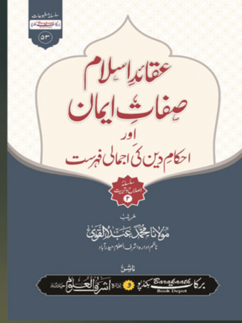
جواب: بینک میں سودی رقم نہیں چھوڑنا چاہیے، کیوں کہ اہل باطل اس کو اپنے مذہب کی ترویج واشاعت میں صرف کریں گے، جب کہ ہمیں تعاون علی الاثم سے منع کیا گیا ہے، اس لئے ان روپیوں کو لے کر بلا نیتِ ثواب غرباء میں تقسیم کردینا چاہئے۔ (محقق ومدلل مسائل، ۲/۳۹۶)

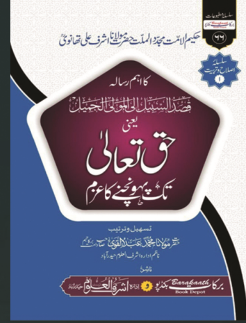
سودی رقم رشوت میں دینا

سوال: سود کا لین دین، اسی طرح رشوت کا لین دین دونوں حرام ہیں، البتہ اگر کسی شخص کے پاس بینک کی سودی رقم ہو، تو اس کا اصل مصرف تو غرباء ومساکین ہی ہے، لیکن یہ رقم کسی کو بطور رشوت دینا کیسا ہے؟

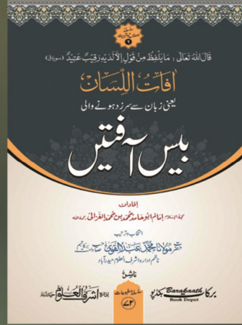
جواب: یہ رقم اپنے کسی کام کے کروانے کے لئے بطور رشوت دینا جائز نہیں ہے، کیوں کہ اس میں خود کا سودی رقم سے انتفاع لازم آتا ہے۔ (محقق ومدلل مسائل، ۲/۴۰۸)

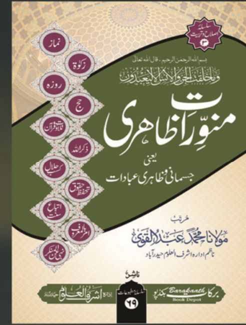


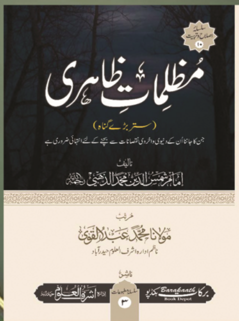


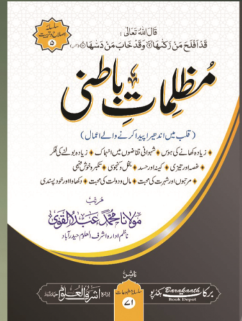


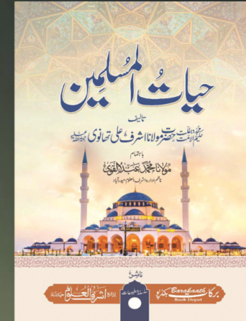












Printer, Publisher & Owner: Mohd Abdul Qavi, # 17-1-391/2, Khaja Bagh, Sayeedabad Colony, Hyderabad- 500059
Published from: # 17-1-391/2, Khaja Bagh, Sayeedabad Colony, Hyderabad- 500059
Editor : Mohammed Abdul Qavi